بنگال میں اردو
وفا راشدی

○ وفا راشدی میں تالیف کا سلیقہ ہے۔ ان کی یہ کوشش ادب میں ایک راستہ صاف کرتی ہے جس سے بہت سی پگڈنڈیاں نکلنے کا امکان ہے۔

احسان دانش

○ اگر اردو ادب کی مکمل تاریخ کبھی لکھی گئی تو وفا راشدی کی تصنیف "پیامِ نو" کا مقام اور راشدی کا نام سنجیدہ اور کارآمد ادب کے معماروں میں ضرور لکھا جائے گا۔ راشدی کی سنجیدہ تحریر اور ان کے عملی ذوق کا چرچا ہر چہار طرف ہے۔

ظفر ہاشمی۔

○ وفا راشدی خوش فکر شاعر یا باکمال افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ تالیف میں بھی ان کی خداداد قابلیت بلند درجہ رکھتی ہے۔

کاملؔ صدیقی بریلوی

○ وفا راشدی بنگال کے ایک پرجوش ادیب اور خوش فکر شاعر ہیں۔

"زمیندار" لاہور

○ وفا راشدی بنگالی ہونے کے باوجود اُردو کا نہایت سلجھا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ اُن کے انتخاب اور انداز میں ایک پختگی ہے۔

"شاہکار" لاہور

○ وفا راشدی جواں فکر و جواں سال مؤلف بذات خود ایک معروف شاعر و ادیب ہے جو اپنی فنی مہارت اور کوشش بلیغ کے باعث اردو ادب میں ایک خاص مقام پیدا کر چکا ہے۔ اس جواں فکر شاعر کے عزائم بہت بلند ہیں۔

"طوفان" حیدرآباد

دستی محمد سہیل

محب گرامی
جناب خواجہ حمید الدین شاہد
جناب کی خدمت میں

۱۱ فضل الدین
۳/۶۲
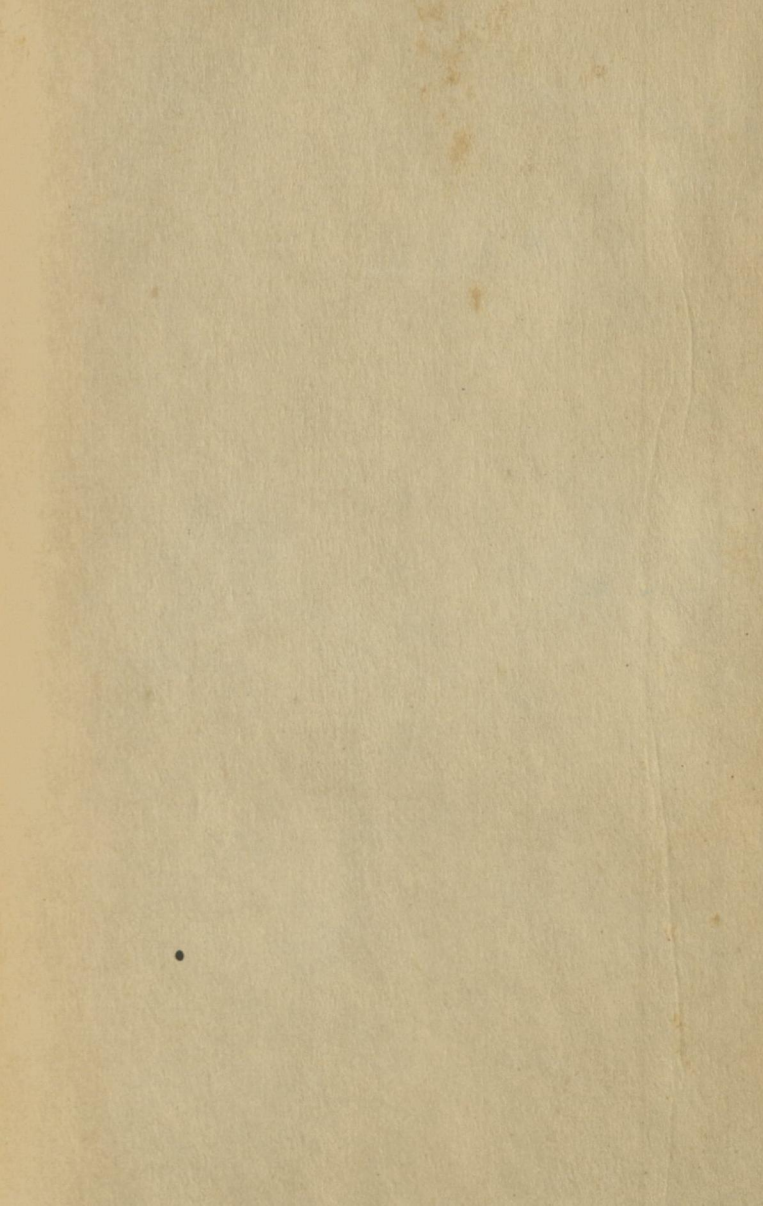
بنگال میں اُردو

یعنی

مشرقی و مغربی بنگال میں اُردو زبان و ادب کی ابتدا سے

۱۹۵۴ء تک کی مکمل تاریخ

وفا راشدی

مکتبۂ اشاعتِ اُردو
حیدرآباد (پاکستان)

قیمت پانچ روپیہ

ناشر
وفا راشدی
مالک مکتبۂ اشاعت اردو
۴۴۴/۲ جیل روڈ حیدرآباد (پاکستان)

بار اوّل ایکہزار
تاریخ اشاعت جنوری ۱۹۵۵ء
مطبوعہ افتخار پریس حیدرآباد (پاک)

کتبہ: احمد مجتبیٰ
بدایونی

وفا راشدی

مصنف و ناشر بنگال میں اردو، پیام نو وغیرہ

سخنہائے امروز

تصاویر

اِنتساب

بنگال کی عظیم المرتبت شخصیت حضرت علامہ رضا علی وحشتؔ کے نام جنہوں نے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ دیا۔ لیکن اپنے لئے کچھ نہیں رکھا ؎

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی!
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے (وحشتؔ)

ہر اُس شخص کے نام جو صوبائی عصبیت مذہبی تعصب اور ذہنی و تمدنی، بُعد کی لعنتوں سے بلند ہو کر اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

ہر اُس مخلص و وسیع النظر اُردو نواز کے نام جو ذاتی مفاد اور خود غرضانہ نظریوں سے بلند ہو کر اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں کوشاں ہے۔

وفاؔ راشدی

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریمہ

ماہر القادری

ایڈیٹر ماہنامہ فاران کراچی

پیشِ لفظ

جناب وفا راشدی نہایت خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ شہرت کی ان کو اگر حرص ہوتی اور پروپیگنڈے کے فن سے وہ واقف ہوتے تو اب تک خاصے مشہور ہو جاتے! سستی شہرت کے وہ قایل نہیں ہیں اور نام پر کام کو ترجیح دیتے ہیں۔

"بنگال میں اردو" وفا راشدی صاحب کی اُردو سے محبت کا ثبوت اور اُنکی کوششوں کی محسوس شہادت ہے۔ صاحب موصوف نے بڑی محنت اور کاوش و تحقیق کے ساتھ اس کتاب کو مُرتب فرمایا ہے ان کی یہ تالیف عوام نہیں بلکہ خواص کیلئے کہی کام کی چیز ہے، بنگال کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی اس کتاب کو "ڈائریکٹری" سمجھیے! اِس خدمت کے لئے انھوں نے نہ جانے کہاں کہاں سے خوشے چُنے ہیں۔ اور اس گلدستہ کے لئے کس کس باغ سے پھول فراہم کیے ہیں۔

ڈھائی سو سال کے شعر و ادب کی تاریخ کو ایک مُجلّہ میں جمع کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جن لوگوں کو تصنیف و تالیف اور تدوین و ترتیب کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کام میں سچ مُچ دانتوں پسینہ آجاتا ہے! پھر یہ کام رنگین وہ دلچسپ کم اور خشک زیادہ ہے، جب تک کسی مؤلف اور اہلِ قلم کو صبر و محنت کی عادت نہ ہو یہ کام انجام کو نہیں پہونچ سکتا ــــ مگر وفا صاحب نے ننھر کاٹ کاٹ کر جوئے شیر

نکالی ہے، اُن کی ہمت یقیناً آفریں کی مستحق ہے!

ان دنوں میری مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ضروری خط جواب کے انتظار کی راہ دیکھ رہے ہیں، ایک کام نبٹاتا ہوں تو دوسرا کام نکل آتا ہے، اس لئے کتاب کے پڑھنے کی فرصت نہ مل سکی، مگر جہاں جہاں سے بھی پڑھ سکا، کتاب کو مفید ہی پایا، تاریخی سنین سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے اور وحشت نہ بھی ہو تو یہ یاد کسے رہتے ہیں' واقعات اور تاریخی سنین کے سلسلہ میں اگر مؤلف کے قلم سے کہیں بھول چوک ہوئی ہے تو اس کی پکڑ وہ حضرات کریں گے جو اس میدان کے مرد ہیں۔

اُردو زبان کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں بڑے بڑے لوگ بیوفائی کر رہے ہیں، زبان و ادب کے معاملہ میں ایسی طوطا چشمی کبھی دیکھنے اور سُننے میں نہیں آئی مگر جناب وفا راشدی صاحب کی یہ تالیف اس کا ثبوت ہے کہ وہ اُردو کے مخلص وفادار ہیں اور انھوں نے اُردو سے جو پیمانِ وفا باندھا ہے وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

مجھے توقع ہے کہ اُردو داں طبقہ میں یہ تالیف (بنگال میں اُردو) پسند کیجائے گی اور بنگال کے بعض سادہ لوح جو دوسروں کے کہنے میں آکر اُردو سے بیگانے بیگانے سے رہنے لگے ہیں اس کتاب کو پڑھ کر اُن کی یہ بیگانگی اُنس و محبت سے بدل جائے گی ——— میرا ہی شعر ہے۔

ہو پھول میں رنگت کیسی ہی خوشبو نہیں تو کچھ بھی نہیں
اس مُلک میں چاہے ہُن برسیں اُردو نہیں تو کچھ بھی نہیں

ماہرُ القادری
مُدیر "فاران" کراچی

۳۰ نومبر ۱۹۵۴ء

تعارف

اقبال حامد دیوبندی۔ چیف ایڈیٹر روزنامہ آفتاب حیدرآباد (سندھ)

مکتبہ اشاعت اردو کی جانب سے مجھے تعارف لکھنے کا حکم ملا ہے۔ "بنگال میں اردو" جیسی عظیم تخلیق یادگار تصنیف اور تاریخی دستاویز میں تعارف لکھنے کا عزم کیا تو پہلا سوال سامنے یہ آیا کہ تعارف کس کا لکھنا ہے تصنیف "بنگال میں اردو" کا یا مصنف (وفا راشدی) کا۔ (؟) اس سلسلہ میں مکتبہ سے رجوع اس لئے نہیں کیا کہ اگر وہاں سے یہ جواب ملا کہ۔۔ "دونوں کا" تو کیا ہوگا ـــــ دونوں کا تعارف لکھنے کی دوہری ذمہ داری میں پڑ جانے کے وہم میں راقم نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ تصانیف کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ صحیفہ پڑھنے والوں کے پاس ہوگا۔ اور وہ خود ہی اس کے بارے میں فیصلے کے مجاز ہو سکتے ہیں لہذا تعارف اس کے مصنف وفا راشدی کا لکھا جائے جو ہر قاری کی نگاہ سے اوجھل ہوگا (گو مصنف کی تصویر زیب کتاب ہے) وفا راشدی کے تعارف پر قلم بدست ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس خالص بنگالی اردو داں نوجوان کے بارے میں راقم کو مشہور و معروف اہل قلم اور موقر جریدوں کے فقرے اور تبصرے مل گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخبار نویس کے ریمارکس پر ہی میں وفا راشدی کا تعارف لکھ رہا ہوں اور ذاتی طور پر میں ان سے واقف نہیں حقیقت یہ ہے کہ میں وفا راشدی کو گذشتہ پانچ برس سے دیکھ رہا ہوں پڑھ رہا ہوں اور پرکھ رہا ہوں لہذا تعریف کے سلسلہ میں عدم معلومات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔!

میرے خیال میں تعارف شروع بھی نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ ضخیم تصنیف۔ ہمہ گیر کتاب اور محیط تاریخ "بنگال میں اردو" نامکمل ہے اور یہ بنگال کے تمام اردو داں اہل قلم کی نمائندگی نہیں کرتی۔ کیونکہ اس میں صرف وفا راشدی کو ہی نہیں

ذکر نہیں ہے جو خود بھی بنگال کا ابھرتا ہوا اور امید افزا طور پر ہمیشہ ابھرتا رہنے والا اردو داں
اہلِ قلم ہے۔ اگر وفا راشدی معمولی قسم کا اردو داں ہوتا یعنی بنگالی ہونے کے باوجود اردو
کا ادیب ہوتا ایسا ادیب جس نے اردو زبان میں افسانے لکھے ہوں۔ مضامین شائع کئے
ہوں۔ اور تھوڑی بہت شاعری کی ہو تب بھی کوئی بات نہ تھی یہاں تو حیرتناک مسرت یا مسرت
انگیز حیرت اس لئے ہے کہ وفا راشدی کئی مشہور کتابوں کا مصنف اور مؤلف اس کے ساتھ
ہی نامور ذنکار ہونے کے باوجود "بنگال میں اردو" کے صفحات میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا
میں سمجھتا ہوں یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر مکتبہ اشاعت اردو کے نزدیک تعارف ضروری قرار پایا۔

وفا راشدی ۲۶ - ۲۷ برس تک کی عمر کا ایک ایسا نوجوان ہے جو اپنی معصوم شکل
اور میانہ قد کی وجہ سے اور بھی کم عمر معلوم ہوتا ہے۔ مگر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی جیسے
بزرگ شاعر اور پروفیسر عندلیب شادانی جیسے پرعظمت فن کار نوجوان وفا راشدی کو سر آنکھوں
پر جگہ دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وفا راشدی کس مرتبہ کا فرد ہے۔ میرے نزدیک
"بنگال میں اردو" جیسی اہم تصنیف کو منظرِ عام پر لانا ہی وفا راشدی کا ایسا کارنامہ ہے۔ جو
اس کو غیر فانی بنانے کیلئے کافی ہے۔ اس کی وجہ وہ محنت اور کاوش ہی نہیں جو اس کو تصنیف
کرنے اور ترتیب دینے میں وفا راشدی نے صرف کی بلکہ سب سے اہم سبب اس کتاب کا اس وقت
ترتیب پانا اور شائع ہونا ہے جبکہ وفا راشدی کے انفرادی اور قومی ماحول کی قطعی ناسازگاری
موجود تھی۔ وفا راشدی نے کئی اچھی اور قابل قدر کتابوں کی تالیف اور تصنیف کے ایک عرصہ
بعد جب بنگال میں اردو کا کام شروع کیا تو ان کی دائم المرض رفیقۂ حیات زندگی کی آخری
منزل پر قدم رکھ چکی تھیں۔ پورے آٹھ گھنٹہ کی سرکاری ملازمت کے بعد مریض بیوی کی دیکھ
بھال کرنا اور تین کم سن معصوم بچوں کا خیال رکھنا وفا راشدی کے فرائض میں داخل تھا۔
اس کی زندگی کا یہ حصہ جس کا سب سے بڑا میں شاہد ہوں اور جس کے دوران "بنگال میں
اردو" لکھی گئی نہایت اذیت ناک تھا۔ میرے نزدیک عام انسان کی یا کسی ادیب کی زندگی

کہ یہ کرب و اذیت سے بھرپور لمحات ہی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں اس لئے وفا راشدی کے
تعارف میں میں اس دردناک مدت کو ہی زیادہ اہمیت دینا چاہتا ہوں جبکہ وفا راشدی اپنے
آبائی وطن (بنگال) سے ہزاروں میل دور کوٹری (سندھ) کے ایک معمولی قصبہ میں ملازمت کی وجہ
تھے علی الصباح قصبہ سے ۹ میل دور اس کو ملازمت پر جانا پڑتا وہاں سے شام کو واپسی ہوتی
اور جائے رہائش میں داخل ہوتے ہی اکثر و بیشتر یہ منظر سامنے ہوتا کہ نوجوان بیوی بیہوش پڑی
ہے یا بخار کی شدت سے بھُن رہی ہے اور دن بھر کے بھوکے پیاسے معصوم بچے جن کی فطرت
اور احساس خودی اور خداداد فنون سے خالی ہیں حسرت و یاس کی تصویریں بنے بیٹھے ہیں۔
گھر میں کوئی دوسرا بڑا یا چھوٹا فرد نہیں۔ اس لڑکھڑا دینے والے عالم میں وفا راشدی کو بیک
وقت بچوں کے لئے کھانے اور تسلیوں کا اور رفیق زندگی کے لئے ڈاکٹر دوا یا اسپتال کا بندوبست
کرنا پڑتا۔ جائے رہائش سے ہسپتال ڈاکٹر اور دوائیں ۵ میل دور حیدر آباد میں دستیاب
ہو سکتی تھیں جہاں آنے جانے کے لئے بس تانگے اور ریل کا ہر وقت ملنا ضروری نہیں تھا۔
وفا راشدی پر ایسی جان لیوا صبحیں اور روح فرسا شامیں ایک دو نہیں گذریں بلکہ کئی برس
تک وہ اس ماحول کی صبر آزمائیوں کے خلاف نبرد آزمائیوں میں مبتلا رہا۔ ناقابل یقین حد تک
حیرت انگیز امر ہے کہ وفا راشدی کی زندگی کا یہی کٹھن حصہ جو ابتلا اور آزمائشوں کے لحاظ
سے مار ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے: بنگال میں اردو کی ابتدا اور تکمیل کا زمانہ ہے۔
کاش مجھے اندازہ ہوتا اور میں احاطۂ تحریر میں لا سکتا کہ وفا راشدی نے اپنی حیات کے اس امتحانی
دور میں یہ بیش بہا کتاب کس طرح مکمل کی اور وہ کس دل و دماغ کا مالک ہے جو لامحدود کلفتوں کے
مستقل ہجوم میں اتنا بڑا کارنامہ کر سکا جس پُرغم اور الم انگیز زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اسی
زمانہ میں مشرقی بنگال کے اندر موجودہ دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان اردو اقتدار کے بھوکے
سیاستدانوں کے ہاتھوں رائفلوں کی باڑھ پر رکھی ہوئی تھی۔ قضیۂ زبان پر ڈھاکہ فائرنگ
سے کچھ عرصہ بعد وفا راشدی نے رنج و اندوہ کے زہر میں بجھا ہوا ایک تیر اپنے جگمہ پر کھایا یعنی

اس کی دائم المریض بیوی پاکستان میں پھیلتے پھسلتے ہوئے موذی مرض میں تڑپنے اور سسکنے
کی تکالیف سے نجات پاکر راہی ملک بقا ہوگئی۔ اب جوانمرگ بیوی کی دائمی جدائی کا ہمیشہ تازہ
رہنے والا غم وفا راشدی کا شریک حیات تھا اور وفا راشدی بیک وقت ملازم، نوی ادیب
اور اپنے بچوں کا ماں اور باپ تھا۔ آزمائشوں اور ابتلائوں کی بھٹی میں تپ کر انسان کندن بنتا
ہے اور ہمارے اہل قلم اور حساس طبع افراد کیلئے تو یہ مقدر ہو چکا ہے۔ پھر وفا راشدی کو ماحول کی ستم
رانیوں سے کیسے نجات مل سکتی تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ خدائے رنج و مسرت اس کو ان انعامات
سے نہ نوازتا جو اس قوم کے دانشوروں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ اس قیامت خیز اور
حشر انگیز فضا میں جبکہ وفا راشدی کے سانسوں کی آمد و شد بھی اس کے نزدیک یورش آلام
سے کم نہ تھی بنگال میں اردو مکمل ہوئی لیکن صفحۂ قرطاس پر خون جگر ٹپکانے والے وفا راشدی
کو اس کد و کاوش کی داد اس طرح دی گئی کہ کوئی پبلشر اس کے اہتمام اشاعت پر اس لئے تیار نہ
ہوا کہ وفا راشدی اسکی ناقدر افزائی ہونے کے ڈر سے اس کو مفت اور بلا معاوضہ دینے کو
تیار نہ تھا۔ سینما کے گانوں اور ٹارزن کی کہانیوں پر یا عریاں فحش اور بازاری لٹریچر کی اشاعت پر
ہزاروں لاکھا غذ صرف کر دینے والوں نے یہ تو اعتراف کیا کہ بنگال میں اردو اپنی نوعیت و افادیت
کے اعتبار سے نادر و نایاب کتاب ہے گی لیکن کاغذ کی گرانی یا عدم فراہمی کا عذر کر کے مسودے کو شکریہ
کے ساتھ واپس کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ وفا راشدی نے ادب دشمن کی آڑ میں ادیب و عالم کا
خون چوسنے والی ان جونکوں کو یہ کہہ کر گھر تک پہنچا دیا کہ "اس کی اشاعت کی راہ میں حائل
ہونے والی ہر رکاوٹ میں میں برابر کا شریک رہوں گا۔"

بنگال میں اردو کی اشاعت دوسری صبر آزما مصیبت تھی جس سے وفا راشدی
کا پالا پڑا۔ اس آخری مرحلہ کو طے کرنے کے لئے عالم لسانیات کے اس جوہر قابل (وفا راشدی)
نے ان بزرگان اردو تک سے رجوع کیا جن کی زندگی اور موت اور اوڑھنا بچھونا اردو ہے
اور جنہوں نے نوابوں راجاؤں ریاستوں کے والیوں اور سرمایہ داروں کے بل بوتے ہی

لیکن درحقیقت اردو کے لئے کافی کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں مگر شاید اس لئے کہ یہ ایک خود دار نوجوان اور دو تین کتابوں کے مصنف و مؤلف کا قابل صد رشک کارنامہ تھا اور اس سے خطرہ تھا کہ ان کی لسانی ٹھیکیداری اور مامس اجارہ داری پر حرف آئے جو وہ اردو کے لئے جہاد کی صورت میں حاصل کئے رہے ہیں انھوں نے بھی باقاعدہ سرمایہ اور ذرائع طباعت واشاعت رکھنے کے باوجود بنگال میں اردو کی اشاعت کی فرمائش کو بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ اور بے چارہ وفا راشدی۔ منزل مراد سے ملحق اس چھوٹی سی شاہراہ پر ہفتوں تک حوصلہ شکن ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ تب کہیں جاکر اس کی اشاعت مکتبۂ اشاعت اردو عمل میں لا رہا ہے۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں وفا راشدی اور بنگال میں اردو کے سلسلہ میں ایک زمانے کے چند واقعات لکھ سکا ہوں لیکن میرے نزدیک وفا راشدی کا تعارف عبارت ہے ان ہی چند واقعات سے جو اگر زیر شرح آئیں تو ایک اور ضخیم کتاب وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

میں نے اس تعارف کے شروع میں متعدد اخباروں اور ماہناموں کے تراشوں کا ذکر کیا ہے جن میں وفا راشدی پر تبصرے کئے گئے ہیں ان تراشوں کو آپ اسی کتاب میں الگ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

آخر میں اس القان کے ساتھ وفا راشدی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں کہ بنگال میں اردو پڑھنے والا ہر شخص اس کے مطالعہ کے بعد میری تائید کریگا۔

بنگال میں اردو ایک بنگالی نوجوان وفا راشدی کا وہ لافانی شاہکار ہے جس نے اس عالم فانی سے گذر چکنے والے اور آئندہ گذرنے والے بنگال کے اردو داں اہل قلم کو حیات جاودانی بخش دی ہے۔

بنگال میں اردو پر دوسری دسالمیر عالم کی طرح دن اور رات کی تہیں چڑھتی چلی جائیں گی اور حوادث و واقعات کے انبار لگتے چلے جائیں گے۔ مگر یہ کتاب اپنے مصنف

وفاداری کے ساتھ اس وقت تک زندہ وتابندہ رہے گی جب تک کہ اردو زبان کے ساتھ اس کو بھی دورِ جہالت کی طرح ذیل کے حال اور مستقبل سے کالعدم نہ کر دیا جائے۔

وفاداری نے بنگال میں اردو جن حالات میں تصنیف کی ان کے لئے اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

چیتے کا جگر چاہئے شاہین کا تجسس

اور اب

بنگال اور اردو پر جو کچھ لکھا جائے گا وہ بنگال میں اردو کا ماخوذ ہوگا۔ یا پھر بنگال اور اردو پر لکھنے والے کو قلم رکھ دینا پڑے گا۔

اقبال مند۔ حیدرآباد سندھ

تقریظِ منظوم

(کاملِ صنعتی بریلوی صدر بزمِ ریاض الادب حیدرآباد سندھ)

مرے دوست مسٹر وفا راشدی — کہ جن کی ہے وقفِ ادب زندگی

شب و روز ہے شغلِ علم و ادب — مضامین نگاری، کبھی شاعری

بڑا شوخ اندازِ تقریر ہے — غضب کی ہے تحریر میں دلکشی

ہیں کیفِ محبت میں ڈوبے ہوئے — بڑی قابلِ رشک ہے زندگی

ودیعت ہے فطرت میں ذوقِ عمل — عیاں ہے ہر اک بات سے برتری

بلندی پہ رہتی ہے ہر دم نظر — ارادوں میں بھی ہے بہت پختگی

ترقیٔ اردو کی ہے آرزو — ہیں سرگرم اس کے لئے ہر گھڑی

زباں پر نہ کیوں آئے بیساختہ — ہو در اصل جو بات انصاف کی

ہے اردو ہی بس ایک ایسی زبان — کہ جس پر ہے سب کی نظر واقعی

بناتی ہے ملت کے کردار کو — مسلم ہے اس کی نمائندگی

ادب کے جواہر سے معمور ہے — بڑی ایک دولت ہی تہذیب کی

اسی کے ہے دم سے ادب کی بقا — ادب بھی مٹے گا جو یہ مٹ گئی

زمانے کو روداد سب یاد ہے — نہ بھولے گا ہرگز زمانہ کبھی

نوازا ہے اردو کو پنجاب نے — عطا کی ہے اس کو نئی زندگی

مگر اس سے بھی کس کو انکار ہے — ہمیشہ دکن پر بھی چھائی رہی

نہیں صرف دلی ہی اس کا وطن — اودھ نے بھی اس پر فدا جان کی

یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں
نظر اس پہ بنگال کی بھی رہی

وفا کی یہ تالیف ہے سامنے
ضرورت نہیں اب کسی بحث کی

وضاحت سے سب کچھ کیا ہے رقم
بظاہر نہیں ہے کمی کوئی بھی

مفصل مشاہیر کا ذکر ہے
بتائی ہے حالت ہر اک دور کی

نوازا ہے اردو کو ہر دور نے
کسی نے کبھی کی نہ پہلو تہی

بالآخر یہ کہنا پڑے گا ہمیں
کہ بنگال میں بھی اشاعت رہی

یہ نسخہ جو پیشِ نظر آج ہے
بڑا قابلِ قدر ہے واقعی

زمانے میں پھر شہرتِ خاص کے
نہ کیوں مستحق ہوں وفا راشدی

حقیقت میں اردو کا محتاج ہے
ہو شرقی مسلمان یا مغربی

سخنہائے گفتنی

بارہ سال سے اس تحقیق و کاوش سے دلچسپی رہی ہے کہ سرزمین بنگال (مغربی و مشرقی) کے اُن علماء و فضلاء، شعراء و ادباء کو دنیائے ادب سے روشناس کراؤں جن کے قومی کارنامے علمی تحریکات اور ادبی خدمات فراموش نہیں کیجا سکتیں۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً میں نے اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے جو برصغیر ہند و پاک کے معیاری جرائد آجکل دہلی، شاعر آگرہ فاران کراچی، ترقی بنگلور، روزنامہ جنگ کراچی۔ آفتاب حیدرآباد (سندھ) جام نو کراچی ندیم پٹنہ، جدید اردو کلکتہ اور ورلڈ ڈھاکہ وغیرہ میں چھپے اور حلقہ ادب میں پسند کئے گئے۔

خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری یہ کوشش اب "بنگال میں اردو"[۱] کی شکل میں ہدیۂ ارباب ذوق ہے۔

میں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور تالیف و تحریر میں جس محنت و کاوش اور تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو بذاتِ خود اسی قسم کے کام سے دوچار ہوئے ہوں۔ ریگزار سندھ جیسے مقام میں بیٹھ کر بنگال میں اردو جیسی کتاب کی تالیف کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سلسلے میں جتنی کتابیں جمع کی تھیں اور جو مواد فراہم کیا تھا وہ ڈھاکہ اور کلکتہ میں رہ گیا۔ باوجود کوششوں کے جب بعض مستند کتابیں سندھ اور پنجاب میں دستیاب نہ ہوسکیں تو مجھے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۴۴ء میں ڈھاکہ اور کلکتہ کا سفر کرنا پڑا۔ اسی کتاب میں اردو زبان کی خدمات اور ترقی و عروج کی

---

[۱] یہ کتاب دونوں بنگالوں کو محیط ہے۔

کی ابتداء سے لیکر آج تک کے ارتقائی جائزے، ادبی تبصرے اور اہل علم و فضل ارباب شعر و ادب کے حالاتِ زندگی مع نمونہ کلام نظم و نثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ میں "بنگال میں اردو کی ابتداء اور اس کی ترقی" پر وضاحت سے بحث کی گئی ہے اس کے بعد بتدریج ارتقاء و ترقی کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل دور قائم کئے گئے ہیں۔

پہلا دور	فورٹ ولیم کالج اور اُس عہد کے دیگر مصنفین۔	سنہ ۱۷۰۰ء تا ۱۸۲۵ء
دوسرا دور	بنگال میں اُردو شاعری کا عروج	سنہ ۱۸۲۵ء تا ۱۸۷۵ء
تیسرا دور	شمس النسخ اور رضا کا زمانہ	سنہ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۱۰ء
چوتھا دور	آزاد، وحشت، ناطق و آرزو کا زمانہ	سنہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۵۴ء

علاوہ ازیں دیگر ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔

(۱) بنگال میں واجد علی شاہ کا زمانہ اور اُن کے ہمعصر شعراء

(۲) بنگال میں علامہ آرزو لکھنوی اور ان کے تلامذہ۔

(۳) بنگال کے ہندو ادیب

(۴) بنگال کی اہل قلم خواتین

(۵) بنگال میں اُردو صحافت

(۶) ادبی انجمنیں۔

(۷) بنگال میں اردو تصانیف و مطبوعات

اس حقیقت کا مجھے اعتراف ہے کہ میں شاعر ہوں نہ ادیب، مؤلف ہوں نہ مصنف، سخن سنجی و سخن فہمی سے بہت دور ہوں۔ مزید برآں میرا تعلق شہر کلکتہ (مغربی بنگال) سے ہونے کے باعث میری آبائی زبان بنگالی ہے لیکن خدمتِ زبان و ادب کا شوق میرے دل میں ایام طالب علمی سے کارفرما ہے اور یہی وہ شوق ہے جس کی بنا پر کچھ نہ کچھ برابر لکھتا رہتا

ہوں۔

اس کتاب میں ایسے حضرات کا تذکرہ بھی شامل ہے جن کا مقام ولادت بنگال نہیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہیں جنھوں نے بنگال میں تعلیم و تربیت پائی، پروان چڑھے اور وہیں پیوند خاک ہوئے اور جو بقید حیات بھی ہیں وہ آجتک وہیں کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ امر اس لئے قابل اعتراض نہ ہوگا کہ میر اور غالب جو دہلوی مشہور ہیں در اصل ان کا وطن آگرہ تھا۔ آخری عمر میں میر لکھنؤ پہنچے اور وہیں کے ہو رہے اور غالب دہلی ہی میں سپرد لحد ہوئے لیکن تاریخ اردو میں ہمیشہ انکا تذکرہ اہل دہلی کی حیثیت سے آتا ہے۔ اسی طرح نظم طباطبائی کا تذکرہ "دکن میں اردو" میں ملتا ہے حالانکہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں تعلیم پائی اور انکی زندگی کا آخری حصہ حیدرآباد دکن میں بسر ہوا۔

میں اپنے حسب ذیل محسنوں اور کرمفرماؤں کا تہہ دل سے شکر گذار اور ممنون احسان ہوں کہ انھوں نے نہ صرف میری ہر طرح حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخدلی سے دیا اور بعض امور میں اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود میری مدد فرمائی۔

خان بہادر علامہ رضا علی وحشت۔ پروفیسر عباس علی خاں بیخود ایم۔اے۔ جرم محمد آبادی۔ ماہر القادری ایڈیٹر فاران کراچی۔ سید محمود طرزی۔ سید امیر رضا مظہری الکاظمی ایم۔اے، بی۔ٹی۔ پروفیسر اطہر قادری ایم۔اے۔ پروفیسر عبدالمجید ایم۔اے۔ افسر ماہپوری۔ مولانا عبدالمعبود و عابد داناپوری۔ رشید الزماں خلش بی۔اے۔ مظہر خیری ایڈیٹر ماہنامہ جام نو کراچی۔ ابراہیم ہوش ایڈیٹر روزنامہ آبشار کلکتہ۔ اقبال حامد ایڈیٹر روزنامہ آفتاب حیدرآباد (سندھ)

"بنگال میں اردو" کا موضوع اس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے کہ زیر نظر تالیف ہر اعتبار سے مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ اور بعض قدیم و جدید انشا پرداز، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور دیگر حامیان ادب کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ بنگال میں بہت سے ایسے

ANGLO INDIAN CHIRISTIAN SCHOLAR

بھی گذرے ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں ضروری تھا لیکن ضخامت کے خیال سے انھیں نظرانداز کرنا پڑا۔ انشاء اللہ اس کی دوسری جلد (VOLUME II) میں یہ کمی پوری کردی جائے گی۔

شاعروں اور ادیبوں کے حالات کی ترتیب میں اختصار کو مدِنظر رکھا گیا ہے تذکرے کو زیادہ پھیلا کر ضخامت بڑھنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لئے کہ یہ کتاب ایک تذکرہ ہے تنقید نہیں۔

سرِ ورق اجمیر کے مشہور آرٹسٹ مسٹر سید عابد علی کے فن مصوری کا مرہونِ منت ہے جس کے لئے میں انکا شکرگذار ہوں۔ سرِ ورق کا پس منظر یہ ہے کہ بنگال جو سبزہ زاروں کی حسین ورنگین دنیا ہے خدا کرے کہ گلستانِ اردو بھی اسی طرح ہمیشہ سرسبز و شاداب اور پھلتی پھولتی رہے۔ آمین ؛

مجھے اس کتاب میں بہت سی فروگذاشتوں کا اعتراف ہے جس کی اصلاح افسوس ہے نہیں کی جاسکی امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

کمترین

وفا راشدی

کوٹری۔ حیدرآباد (سندھ)

۱۵ر جنوری ۱۹۵۵ء

۲۰ر جمادی الاول ۱۳۷۴ھ

ترتیب

چوتھا دور سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۵۴ء

آزاد، وحشت، ناطق و آرزو کا زمانہ

پہلا گروپ

دوسرا گروپ

بنگال میں آرزو لکھنوی اور ان کے تلامذہ

بنگال کے ہندو ادیب

بنگال میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی

تمہید بنگال[1] ہمیشہ سے سیاسی و سماجی جدوجہد اور انقلابی تحریکات کا مرکز، علم و ادب کا مخزن۔ شعر، نغمہ و موسیقی کا سرچشمہ اور رقص و سرود، چنگ و رباب کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں تک اردو کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت کا تعلق ہے بنگال کو بھی برصغیر پاک و ہند کے دیگر مشہور صوبوں کی طرح "مرکز اردو" ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مشہور فرانسیسی عالم و مورخ موسیو گارسان دی تاسی نے اپنے 'خطبات' کے صفحہ ۱۱۸ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"اردو کے مرکز یہ شہر ہیں ——— دہلی۔ آگرہ۔ لاہور۔ میرٹھ۔ لکھنؤ۔ بنارس۔ کانپور مرزاپور۔ فیض آباد۔ الہ آباد اور ——— کلکتہ[2]۔ جہاں ہندوستانی[3] مثل صوبہ جاتی زبان کے بولی جاتی ہے۔"

---

[1] مشرقی و مغربی دونوں بنگال مراد ہے۔ تقسیم کے باعث بنگال میں سیاسی حالات کے زیر اثر زبان و ادب میں جو انقلاب رونما ہوا اس کا اندازہ آگے کے صفحات کے مطالعہ سے ہو جائیگا۔ [2] کلکتہ مغربی بنگال کا وہ شہرۂ آفاق شہر ہے جسے برصغیر ہند و پاک کے تمام شہروں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ [3] بنگال میں اردو کو عموماً ہندوستانی یا دیسی زبان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ وہاں کے ۵ ، فیصدی باشندے باوجود صوبائی زبان بنگالی کے

داستانِ اُردو

آج سے دو ہزار سال قبل ہندوستان کے عوام کی زبان تامل، اوڑیا، تیلگو وغیرہ تھی۔ جب آریہ قوم نے وسط ایشیا سے اتر کر شمالی ہند پر حملہ کیا تو وہاں کے قدیم باشندے اپنا وطن اور گھر وبار چھوڑ کر جنوبی ہند کی طرف بھاگے اور وہاں آباد ہونے پر مجبور ہوئے۔ آریہ قوم نے فاتح کی حیثیت سے پنجاب اور گنگا کے کنارے پر اپنا تسلط جما لیا۔ یہ ایک تاریخی امر ہے کہ جب کوئی فاتح قوم کسی نئی سلطنت پر برسرِ اقتدار آتی ہے تو وہاں کی مفتوح قوم پر سب سے زیادہ اثر اس کی زبان کا ہوتا ہے۔ آریہ قوم اپنے ساتھ زبان سنسکرت لائی تھی۔ لہٰذا اس زبان کی اشاعت لازمی امر تھی۔ چونکہ یہ فاتح کی زبان تھی اس لئے تمام بول چال میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوتی تھی۔ فاتح و مفتوح قوموں کی زبانیں ایک دوسرے سے اس طرح مل گئیں کہ سنسکرت اپنا اصل روپ بدلتی گئی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک نئی شکل میں نمودار ہوئی جس کا نام پراکرت رکھا گیا۔ پھر پراکرت نے خاص و عام میں وہ مقبولیت حاصل کر لی کہ نہ صرف روزمرہ کے امورِ زندگی میں بولی جانے لگی بلکہ عوام کی جھونپڑیوں سے نکل کر امیروں اور حکمرانوں کی مجلسوں تک پہنچ گئی۔ دربارو میں اس نے شرفِ باریابی حاصل کیا اور دفتروں میں رسائی پائی۔ بتدریج اس زبان نے اتنی ترقی کی کہ مستقل ادب کی حیثیت اختیار کر لی صرف یہی نہیں بلکہ علم و مذہب کی متعدد کتابیں بھی پراکرت ادب میں شامل ہوئیں۔

۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء میں جب راجہ بکرماجیت کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا تو اس کے عہد میں قدیم سنسکرت کو از سرِ نو چلانے کی کوشش کی گئی اور سرکاری زبان قرار دی گئی۔ لیکن اس وقت تک عوام پراکرت سے اس قدر مانوس ہو چکے

تھے کہ سنسکرت کی بجائے پراکرت اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی لیکن پراکرت نے بھی تھوڑی عمر پائی اور سنسکرت کی طرح اس کی اصلیت بھی باقی نہ رہی پھر ایک دور وہ آیا کہ وہ بھاکا یا برج بھاشا کی نقاب اوڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے شمالی حصہ میں برج بھاشا مروج ہو چکی تھی یہ زبان نہایت شیریں اور پیاری تھی۔

سنہ ۸۰۰ء کے آغاز میں ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۰۰۰ء میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر چڑھائیاں کیں اس زمانہ میں بھاشا کو ترقی ہوئی۔ چار سو سال کے بعد شاہان مغلیہ کا دور دورہ ہوا۔ ۱۵۰۵ء میں شہنشاہ بابر نے اپنی سلطنت کی مستحکم بنیاد رکھی۔ مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی اور فارسی میں بہت سے ترکی و عربی کے الفاظ بھی شامل تھے۔ سلاطین مغلیہ کے عہد میں بہت سی دوسری قومیں غیر ممالک سے بھی آئی تھیں جن میں یورپ کی پرتگالی اور فرانسیسی و ترکی قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کی قدیم زبان، فاتحوں کی نئی زبان، اور غیر ملکیوں کی متعدد زبانوں کے آپس میں ربط و ارتباط کے علاوہ شاہجہاں کے عہد میں سپاہیوں اور عوام کی بول چال کی وجہ سے فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی اور پرتگالی الفاظ کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ بھاشا کی اصل بالکل ہی بدل گئی اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ چونکہ ترکی زبان میں اردو کے معنی لشکر کے ہیں اس لئے اس کا نام بھی "اُردو" قرار پایا۔ بعد میں اس زبان پر مذہبی تعصب کا کچھ اس طرح رنگ چڑھا کہ اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دی گئی جو صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہی فوج میں ہندو مسلمان سب ہی شامل تھے اور دونوں قوموں کے اتحاد، محبت اور میل جول سے اس کی نشوونما ہوئی لہذا اُسے مشترکہ زبان تسلیم کرنا یقیناً بجا ہے۔

اب اردو زبان اس قابل ہو گئی ہے کہ یہ نہ صرف بنگال سے لے کر کشمیر تک

اور سندھ سے لے کر دکن تک بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ شمالی وجنوبی ہند کی در و دیوار سے گذر کر چین و عرب، مصر و عجم، یورپ و امریکہ کی دنیا میں چھا چکی ہے۔ خصوصاً یورپ کی یونیورسٹیوں میں جہاں علوم مشرقیہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے وہاں اردو زبان کی تعلیم کا بھی ایک ایک شعبہ موجود ہے۔

بنگال میں اردو کی ابتدا

اردو کی ابتدا کے متعلق صوبوں کے مصنفوں اور ادیبوں نے عموماً اپنے صوبے میں اردو کی ابتدا بتلائی ہے۔ کسی نے اس کی ابتدا پنجاب سے کسی نے سندھ اور دکن سے اور کسی نے دوآبہ گنگا جمنا سے۔ صوبائی جذبے نے حقیقت پر کچھ اس طرح نقاب ڈال رکھا ہے کہ ابتک کسی غیر جانبدار مورخ نے صحیح طور پر اس کی مولد بتلانے میں حق و انصاف سے کام نہیں لیا۔ جہانتک میری نظر نے کام کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُردو کی ابتدا کسی خاص صوبے سے منسوب کرنا ہرگز قرین انصاف نہیں۔ شاہجہاں کے عہد میں جب پراکرت کی بیٹی بھاشا نے اردو کا روپ دھارا تو اس زبان کے پرستار دہلی یا شمالی ہند تک محدود نہ تھے بلکہ وہاں کے باشندوں کو شمال وجنوب کے مختلف مقامات میں آمد و رفت کا موقع ملتا رہا اس طرح جہاں جہاں وہ لوگ گئے نئی بولی اپنے ہمراہ لیتے گئے اور وہاں اردو زبان پھیلتی گئی۔

اس کی وضاحت میں ناطق لکھنوی کی حسب ذیل عبارت بطور سند کافی ہے:-

"اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور فرمایئے جو شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا، دلی میں آکر دریا بنا، اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں ایک بنگال کو گئی، ایک بہار کو، ایک اودھ کو اور ایک گجرات کو یہاں یہ شاخ تمام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔ اودھ میں

جو شاخ پہنچی اس کے پانی کو تمام ہندوستان خصوصاً آگرہ اور دہلی
کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنؤ میں صاف کیا اور صاف
کر کے تمام ملک میں نہریں دوڑادیں۔" (نظم اردو صفحہ ۱۵)

آپ نے دیکھا کہ دریائے دہلی کی شاخیں بیک وقت بنگال، بہار، اودھ، گجرات تک پھیل گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ دکن میں اس شاخ نے سمندر کی سی حیثیت اختیار کر لی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنگال کو بھی اردو کی آماجگاہ ہونے کا شرف اُسی وقت سے حاصل ہوا۔ جب اردو کی ابتدا ہوئی اس کی مزید صراحت آگے کیجائیگی۔

بہار کے شعرا میں حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا کلام آٹھویں صدی ہجری میں اور اودھ کے کبیر کا نوی صدی میں ملتا ہے۔ تو آٹھویں صدی ہجری میں بنگال کے شعرا مثلاً مخدوم اشرف جہانگیر وغیرہ کا تذکرہ و نمونۂ کلام بھی دستیاب ہوتا ہے بنگال کے سلطان حسین شاہ جو بہت بڑا علم دوست، سرپرست اور قدردانِ زبان و ادب تھا۔ کے زمانے میں اردو اور بنگلہ دونوں ادب نے وہ فروغ پایا کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ عربی و فارسی کی بیشمار کتابیں اسی کے زمانے میں اردو میں منتقل ہوئیں

ایام حسین شاہ سنہ ۹۰۹ھ میں تخلص مصنف برگاؤنی جو اس کا درباری شاعر تھا اور ایک باکمال صاحب علم و فضل، حسین شاہ کی مدح میں کہتا ہے ؎

شاہ حسین آہے بڑا راجہ چتر سنگھا سن ان کو چھاجا

بہاؤالدین باجن متوفی سنہ ۹۱۲ھ اس کا ہم عصر شاعر تھا ؎

باجن جو کی کے عیب ڈھانکے اُس سے ارجن تھر تھر کانپے

اس قسم کی اردو دسویں صدی کے شعرا مثلاً شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور بہاؤالدین برادی کے کلام میں بھی عام ہے۔ شیخ جیون مجوب عالم مولانا عبدی گیارہویں صدی کے مشہور شعرا گذرے ہیں۔ اس زمانے میں نہ صرف پنجاب و دہلی

ہیں بلکہ بنگال، اودھ، بہار اور ہر شمالی و مشرقی صوبے میں عام طور سے اوسط درجہ کی صاف اور شستہ اردو بولی جاتی تھی اور نظم ہوتی تھی۔

(نظم اردو ص ۴۲)

۲۴ بہار میں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری متوفی ۷۸۲ھ کے ملفوظات میں نہایت فصیح اردو ہے۔

۲۵ بنگال میں شیخ نور الحق پنڈوی متوفی ۸۱۳ھ کے اردو جملے اور اقوال برابر ملتے ہیں۔ تقریباً اس زمانے میں قطبینی شاعر پنجاب سے یہاں آیا کٹک میں ایک نامعلوم مدت سے نہایت عمدہ اردو بنگال (مرشد آباد) کے ذریعہ پہنچی۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیری کی اردو سے بنگال، بہار اور اودھ کو شرف حاصل ہوا۔ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیر بنگال میں بھی رہے۔

۲۶ یعنی پنجاب سے دہلی، دہلی سے دولت آباد، اودھ، بہار، بنگال اور دولت آباد سے گجرات، گجرات سے بیجاپور دکن، اور بنگال سے کٹک اسی طرح تمام صوبوں میں اردو پہونچ گئی۔

۲۷ بنگال میں اردو کی ابتدائی دور کے چند شعرا کے تصنیفات و ملفوظات کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

مخدوم اشرف جہانگیر ۔۔۔ مولد سمنان، مسکن بنگال میں وفات ۷۹۰ھ

"چھیری کے منھ کھنڈ اسمائے ۔۔"

"چھیری" یعنی بکری اور کھنڈ کے معنی چاول کا چورا۔

ان کے ایک منتر میں ہے ۔۔۔ "سوا لاکھ سپاری بندھوں" یعنی باندھوں

شیخ نور الحق پنڈوی۔ مولد لاہور، مسکن بنگال میں وفات ۸۱۳ھ

"پیوند پوچھے پا تری مجھ سہاگن ماؤں"

(نقوش اردو حاشیہ ۲۴ تا ۲۷ صفحات ۳۰-۲۴-۲۲۰)

اٹھارویں صدی عیسوی یعنی برطانوی دورِ حکومت میں ملی مبلغین نے تبلیغی امور میں بھی اردو کو استعمال کیا۔ شمالی و جنوبی ہند کے گرجاؤں مثلاً سرِ ہند کی بیگم ثمرو کے گرجا اور آگرہ کے کیتھولک چرچ میں جو اردو بولنے والوں کے صوبے ہیں کے علاوہ صوبہ بنگال کے مختلف شہروں مثلاً کلکتہ، سیرام پور۔ مرشد آباد وغیرہ کے ہندوستانی گرجاؤں میں بھی اردو زبان کو عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور توسیع و عبادت کا ذریعہ قرار دیا۔ بعض گرجاؤں میں بنگالی زبان بھی ذریعۂ تبلیغ رہی۔

سرچارلس ٹری ویلین Sir Charles trevliyan نے اعلان کیا تھا کہ ۵۰۰ روپے کا انعام اس شخص کو دیا جائیگا جو اردو زبان میں، عربی کی سائنس اور موجودہ یورپین سائنس کے باہمی تعلق پر سب سے اچھا مضمون پیش کرے گا چنانچہ ایک مضمون بمبئی سے آیا۔ اور دوسرا کلکتہ سے۔ کلکتہ والا مضمون مولوی عبیداللہ استاد ہوگلی کالج کا تھا۔ اس مضمون کی جانچ کے لئے ولیم میور نے مولوی محمد وحید کو مقرر کیا تھا۔ عبیداللہ کا مضمون بعض لحاظ سے بہتر تھا۔ لہٰذا یہ انعام انھوں نے حاصل کیا۔ یہ ہیں بنگال میں اردو کی ترویج کے ابتدائی حالات۔

(خطبات گارساں دی تاسی صفحہ ۵۶۸)

اُردو تقریریں

بنگال میں زبان اردو نہ صرف روزمرہ کی ضروریات و معاملات زندگی کے سلسلہ میں مروج رہی ہے۔ بلکہ عام جلسوں، عدالتوں، انجمنوں، اسکولوں اور کالجوں میں بھی اکثر و بیشتر تقریریں اُردو ہی میں ہوتی رہی ہیں جس کا اندازہ ذیل کے چند ایک تاریخی واقعات سے بخوبی ہو جائے گا۔

جب بنگال کے راجہ نندی کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تو اس کی ایک تاریخ ۸ جون ۱۷۷۵ء کے دن وکیل نے مجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ مدعی و مدعا علیہ کو اجازت دی جائے وہ اپنا اپنا بیان ہندوستانی زبان (اردو) میں دیں کیونکہ یہ ایسی زبان ہے جسے بنگال میں ہر شخص بولتا اور لکھتا ہے۔

صوبۂ بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر جے بی گرانٹ جب اپنی میعاد گورنری پوری کرنے کے بعد ہندوستان چھوڑ رہے تھے تو باشندگانِ کلکتہ کے زیر اہتمام ۱۷ اپریل ۱۸۶۲ء کو ایک ایک جلسہ منعقد ہوا جلسہ کے صدر راجہ راؤ کانت دیو بہادر تھے۔ اعلیٰ افسران میں انگریز و ہندوستانی سب ہی موجود تھے۔ راجہ کالی کرشن بہادر جیسے اردو کے مشہور شاعر و ادیب بھی شریک تھے۔ گورنر کی خاص ہدایت تھی کہ تقریریں اُردو میں ہوں۔ چنانچہ اُس روز کی تمام تقریریں بنگالی یا انگریزی کی بجائے اُردو زبان میں کی گئیں۔ عوام کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ بھی اردو زبان میں تھا۔

۱۸۶۴ء میں انجمن "مجلس مذاکرۂ علمیہ اہل اسلام" کی طرف سے زیر صدارت نواب عبداللطیف بہادر مرحوم ایک جلسہ منعقد ہوا۔ سر سید احمد بھی تشریف لائے تھے انھوں نے علم و حکمت اور قومی خدمات پر ایک مفصل تقریر کی جو اردو میں تھی۔ ان کے علاوہ جن حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ اردو میں کیں۔

اخبار انڈین میل مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۴ء میں درج ہے کہ کلکتہ اور مضافات کلکتہ میں نمائش کے سلسلہ میں کلکتہ کی پبلک نے ۱۸۶۴ء میں آنریبل سسلی بیڈن (گورنر بنگال) کی خدمت میں جو ایڈریس پیش کیا تھا۔ وہ اس اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اُردو زبان میں تھا نہ کہ انگریزی یا بنگلہ میں۔

شہزادہ ویلز کی شادی کے موقعہ پر ہندوستان کے تمام شہروں

یں جلسے منعقد ہوئے ۱۸ مئی کو کلکتہ میں جو جلسہ ہوا اس میں منشی امیر علی نے اردو میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی ۔ مقامی اخباروں میں اس تقریر کا انگریزی میں ترجمہ شائع ہوا ۔

(خطبات گارساں دتاسی صفحات ۳۷۳-۳۷۲)

عصر حاضر میں بھی بنگال میں مذہبی، قومی و سیاسی سرگرمیاں ہمیشہ اردو زبان ہی میں ہوتی رہی ہیں مسجدوں میں نماز کے خطبات، جلسوں میں لیڈروں کی تقریریں اردو میں ہوتی رہی ہیں ۔ مولانا محمد علی ۔ مولانا شوکت علی ۔ مولانا ابو الکلام آزاد جیسے یکتائے روزگار ۔ علماء و سیاست داں اردو میں تقریر کرتے رہے ۔ قائد اعظم محمد علی جناح خود اردو صاف اور صحیح نہیں بول سکتے تھے مگر چونکہ اہل بنگال اردو زبان بولتے اور سمجھ لیتے ہیں ۔ لہذا ۱۹۴۶ء میں کلکتہ اور ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں انھوں نے جو تقریریں کیں وہ اردو میں تھیں ۔ آج بھی سرزمین بنگال میں ایسی قابل قدر و شہرۂ آفاق ہستیاں بقید حیات ہیں جو خالص بنگالی ہونے کے باوجود اردو زبان میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کرتے ہیں ۔ ان میں متحدہ محاذ کے ہر دلعزیز لیڈر حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعلیٰ متحدہ بنگال، مولوی ابو القاسم فضل الحق سابق وزیر اعلیٰ متحدہ بنگال و مشرقی پاکستان ۔ خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل و وزیر اعظم پاکستان اور مولانا اکرم علیخاں ۔ ایڈیٹر روزنامہ آزاد ڈھاکہ کے اسمائے گرامی اہل بنگال کے لئے باعث ناز و افتخار ہیں ۔

اردو مطبوعات

ذیل میں چند مطبوعات کی ایک نامکمل فہرست پیش کی جاتی ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں منظر عام پر آئیں ۔ اور جن کی نشر و اشاعت کا فخر بنگال کو حاصل ہے ۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۹ء میں بنگال کے صرف شہر کلکتہ میں بیس مطبع تھے ۔

(نوٹ ص۱۰ پر ملاحظہ ہو)

الف:- ایک انگریز افسر جس کا نام ایس۔ ڈبلو۔ فیلن تھا (S. W. fallen) نے اجمیر میں ایک انگریزی ہندوستانی لغت مرتب کی تھی۔ جو ۱۸۵۶ء میں کلکتہ میں چھپی۔

ب:- سنہ ۱۸۱۱ء میں میر محمد تقی میر کا "کلیاتِ میر" سب سے پہلے کلکتہ میں طبع ہوا۔

ج:- گلدستۂ نشاط ایک اردو تذکرہ ہے جس کے مؤلف کا نام معلوم نہ ہو سکا ۱۲۵۲ھ یعنی ۱۸۳۶ء میں بمقام کلکتہ شائع ہوا۔

(خطباتِ گارساں دتاسی ص ۶۸)

د:- مولوی عبد اللہ نے ہگلی میں ۱۸۲۹ء میں قرآن مجید کا اور ۱۸۳۲ء میں "تنبیہ الغافلین" کا اردو ترجمہ چھپوایا۔ اول الذکر کا ترجمہ شاہ عبد القادر نے اپنے بھائی شاہ عبد العزیز کی تفسیر قرآن موسوم بہ "تفسیر عزیزی" فارسی زبان سے اردو میں کیا تھا۔ آخر الذکر کا ترجمہ خود مولوی عبد اللہ نے مولوی سید احمد شہید کی عربی کتاب سے کیا تھا۔

(تاریخ نظم و نثر اردو ص ۲۳۹)

محمود الرب خالد بنگالی مرحوم نے رسالہ اختر کے افتتاحیہ میں سپرد قلم کیا ہے۔ سہیل یمن، مصنف نصیر الدین حیدر مرحوم کی مشہور تالیف ہے جو سوفٹ کی ایک قابل قدر تقریظ فارسی میں "مؤید برہان" میں شامل ہے۔ یہ وہ تقریظ

(نوٹ ص ۹) بنگال کے مطبع کی مکمل فہرست کوئی پچاس سال قبل selection from the Records of Bengal Govt: کے نام سے چھپی تھی اس کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔

ہے جس کی شمولیت سے موئید یہ زبان کی قدر و وقعت میں چار چاند لگ گئے۔ یہ کتاب بھی بنگال ہی میں شائع ہوئی۔

دورِ اوّل کی بہترین مثنوی "بکاؤلی" سید ریحان الدین مرحوم کی تصنیف ہے اور یہ اردو زبان کی شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ نصیر الدین حیدر اور رشید ریحان الدین دونوں نے سرزمین بنگال میں آنکھیں کھولیں اور وہیں پیوند خاک ہوئے مذکورہ بالا مطبوعات کے علاوہ بے شمار کتابیں بنگال میں شائع ہوئیں جن کی ایک فہرست کتاب کے آخر میں درج کی جائے گی۔

بنگالی اور اُردو

بنگالی بحیثیت صوبائی زبان سرزمین بنگال میں صدیوں سے بولی اور سمجھی جاتی ہے یہ دراصل سنسکرت کی کئی شاخوں مثلاً پراکرت، مرہٹی، گجراتی، ہندی، مائتھلی، آسامی اور اردو وغیرہ میں سے ایک ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ سنسکرت کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا نام "بنگالی" رکھ دیا گیا۔ اس زبان میں بعد میں عربی، فارسی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کی زبانوں کے الفاظ بھی کثرت سے شامل ہوئے۔

بنگالی زبان کی ابتدا کے متعلق بھی مختلف کہانیاں ہیں، مگر مزید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ بدھوں نے اس کی داغ بیل ڈالی گو سینوں کے عہد حکومت میں اس کی توسیع و اشاعت کی راہ میں مذہبی تعصب کا پردہ حائل رہا لیکن سین حکومتوں کے خاتمہ کے بعد ہی مسلمان بادشاہوں کے زیر سرپرستی اس نے وہ ترقی اور عروج حاصل کیا کہ پھر اسے کوئی طاقت مٹا نہ سکی۔ اردو کی طرح بنگالی زبان بھی ہندو مسلم اتحاد کی آغوش میں پروان چڑھی اور بتدریج ارتقائی راہوں سے گذر کر اسی منزل پر گامزن ہوئی کہ ایک صوبائی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔

عہد برطانیہ عیسائی مبلغوں اور معلموں نے گرجاؤں اور درس گاہوں

میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی ذریعہ تعلیم و تبلیغ قرار دیا۔ فورٹ ولیم کالج اور
سیرام پور کے پادریوں کی مدد سے بے شمار عربی و فارسی کتابوں کا بنگالی میں بھی
ترجمہ ہوا۔ ان کتابوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ اس طرح شامل ہو گئے۔
کہ بعض بعض جملے یا ٹکڑے بالکل اردو کے معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ عربی
و فارسی نظمیں بھی اکثر و بیشتر بنگالی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ انیسویں صدی
کے جن مصنفوں نے عربی و فارسی سے بنگالی زبان کو مالا مال کیا ان میں
عبدالعلیم مصنف ہانیفر لڑائی (جنگِ حنیف) قصص الانبیاء، منور علی
کی الماس گل، ریحان شاہی، گل بکاؤلی ارادت علی وغیرہ مشہور ہیں۔

پندرہویں صدی سے آج تک سرزمین بنگال نے اسی زبان میں وہ
شاعر، ادیب، مصور اور فنکار پیدا کئے جن کی تخلیقات گراں مایہ و بلند پایہ سے
ایک دنیا حیران اور ایک عالم انگشت بدنداں ہے۔ یعنی فنکاروں میں سے
اکثر و بیشتر بنگالی ادب کے ستون مانے جاتے ہیں اور بعض کا شمار دنیا کے بڑے
مفکروں اور جلیل القدر فنکاروں میں ہوتا ہے۔ قدیم و جدید فنکاروں
میں شیخ فیض اللہ، سید شاہ الاوّل، قاضی دولت، بہرام خاں، کیقباد،
شرف حسین، قاضی نذر الاسلام، جسیم الدین، غلام مصطفیٰ، فرخ احمد مسلمانوں
میں، راجہ رام موہن رائے، رام رام باسو، میکائیل مدھو سودن، رابندر ناتھ
ٹیگور، سرت چندر چٹرجی۔ غیر مسلموں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سپہر ادب کی اس محفل ماہ و انجم میں قاضی نذر الاسلام اور رابندر ناتھ
ٹیگور سب سے بلند مقام پر تاباں و درخشاں نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی
شبہ نہیں کہ ٹیگور نے گیتان جلی لکھ کر نوبل پرائز حاصل کیا۔ اور عالمگیر
شہرت کا مالک بنا لیکن قاضی نذر الاسلام اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث

ٹیگور سے کہیں زیادہ ممتاز ہے جس کا اعتراف خود ٹیگور نے ان الفاظ میں کیا ہے ــ "نذر الاسلام کی بے پناہ انفرادیت و افادیت ٹیگور کی حد نگہ سے بہت آگے بڑھ چکی ہے ــ"

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حسین شاہ کے عہد حکومت میں بنگالی ادب کے دوش بدوش اردو ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا - ابتدا سے فارسی بطور شاہی زبان بولی جاتی تھی - مذہبی، تعلیمی و تبلیغی معاملات میں عربی زبان استعمال ہوتی تھی امراء اکثر عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے اردو بولا کرتے تھے - سنہ ۱۴۰۷ئی چینی سیاح ھوآن جو بنگال آیا تھا اس نے بنگال کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے زبان کے متعلق کہا تھا -

- عوام کی زبان بنگالی ہے - فارسی بھی بولی جاتی ہے -" اس کے اس بیان سے میرے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے - کہ بنگال میں فارسی قدیم زمانے سے رائج رہی - حسین شاہ کے زمانے میں عربی و فارسی و اردو کے باہمی ارتباط کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب، مصر، ترکی اور دیگر غیر ممالک کے تاجروں کے علاوہ جو درویش، فقراء، سنیاسی اور مذہبی پیشوا بنگال آئے تھے وہ تبلیغی امور کے سلسلہ میں اپنی اپنی زبان میں تقریریں یا گفتگو کرتے تھے جس کی وجہ سے بنگالی عربی، اور فارسی الفاظ کے خلط ملط کے باعث اردو ترقی کرتی گئی - بنگال کے دیہاتی گیت میں جو 'پوتی' کے نام سے مشہور ہیں - عربی و فارسی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں اور بنگال کے غریب مزدور کسان آج بھی ان گیتوں کو جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں - یہ گیت عہد حسین شاہ کی یادگار ہیں -

علاوہ ازیں بنگالی زبان میں قرآن مجید کے دس سے زائد ترجمے

(سب سے پہلا ترجمہ ایک ہندو ادیب کرشن چندر اسین باشندۂ ڈھاکہ نے کیا تھا) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات، حدیث شریف، گلستاں، بوستاں، پند نامے، حسن و عشق، دیو، جن، پری، وغیرہ کی کہانیوں، قصص الانبیا یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، لیلےٰ مجنوں، الف لیلیٰ، قصۂ گل بکاؤلی کی منتقلی اس بات کی سند ہے کہ بنگالی ادیب اپنی مادری زبان (بنگالی) کے علاوہ عربی، فارسی و اردو سے بھی بدرجۂ کمال واقفیت رکھتے تھے۔ گارساں دی تاسی نے اپنے خطبات صفحات ۶۸-۷۰ میں لکھا ہے کہ "بنگال میں ہندو علاوہ اپنی صوبائی زبان بنگلہ کے ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور مسلمان صوبہ جات شمالی و مغربی اردو استعمال کرتے ہیں۔ سنہ ۱۷۱۳ء کے بعد ایک شخص پریاداس ساکن بنگال نے بھگت مال لکھی اس شخص کا تعلق وشنوں کے ایک فرقے سے ہے جس کا بانی نتھانند تھا۔"

آج بنگالی زبان پر اردو اس طرح مسلط ہے کہ بنگال میں پچھتر[75] فی صدی باشندے اردو بولتے اور سمجھ لیتے ہیں۔ اور پچاس فی صدی بخوبی لکھ پڑھ لیتے ہیں صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ دیہاتوں اور قصبوں میں بھی عام طور پر بچوں کی تعلیم کی ابتدا گھروں، مسجدوں یا مکتبوں میں عربی اور اردو سے ہوتی ہے اسکولوں اور کالجوں میں فارسی و عربی و اردو کے شعبے موجود ہیں۔ وہ طلبا جو انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان بنگالی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں ساتویں جماعت میں انھیں عربی، فارسی اردو میں سے ایک زبان کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ اور اس طرح اردو لکھنے پڑھنے پر ہو جاتے ہیں۔

سنہ ۱۷۰۰ء تا ۱۸۲۵ء

پہلا دور

فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور اس عہد کے دیگر مصنفین

تمہید اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں جب عہدِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہو گیا۔ اور انگریزوں کا آفتابِ حکومت طلوع ہوا تو اس وقت تک ہندوستان کی دفتری زبان فارسی تھی۔ نئے گورنر جنرل لارڈ وارن ہسٹنگز کے زمانے میں جا بجا اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ جہاں انگریزوں کو فارسی اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔ لیکن ہندوستان کے حالات و کوائف، تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت سے

بہرہ ور ہونے اور وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے سے ربط و ارتباط پیدا کرنے کے لئے انگریزوں کے نزدیک اردو سے بہتر کوئی اور زبان اس کام کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اردو کو رواج دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۳۴ء میں فارسی کی بجائے اردو کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ لارڈ وارن ہسٹنگز کے بعد جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو ان کی زیرِ نگرانی بمبئی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ (مغربی بنگال) کی بنیاد ڈالی گئی۔ جہاں سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو فارسی و ہندوستانی دونوں زبانوں میں بہتر سے بہتر تعلیم دی جانے لگی اصل مقصد یہ تھا کہ حکومت کو زبان کے ذریعہ امورِ سیاست اور تنظیم ملک گیری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں۔

فورٹ ولیم کالج کا کام یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ اردو کو فروغ دینے کی اسکیم باقاعدہ عمل میں آئی۔ ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے علماء و فضلاء اور شعراء دربار کا عہدۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ پر تقرر ہوا۔ انھوں نے وہ بلند پایہ و عدیم المثال کتابیں لکھیں جو آج تک اردو ادب کا گرانقدر سرمایہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان مصنفوں میں مسلم اور غیر مسلم سب ہی شامل تھے۔ ہندو مصنفوں کا ذکر "ہندو ادیب" کے باب میں کیا جائے گا۔

فورٹ ولیم کالج سے پہلے نظم و نثر اردو میں کئی کتابیں موجود تھیں۔ فضلی شاعر نے ۱۷۳۲ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں "دہ مجلس" کے نام سے ایک کتاب نثر میں لکھی تھی۔ ۱۱۴۱ھ میں شمس ولی اللہ نے ایک مثنوی "شہدائے کربلا" کے حالات میں قلمبند کی تھی۔ تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ

کر 'دہ مجلس' بھی فضلی کی طبعزاد نہیں ملّا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب 'روضتہ الشہدا' کا ترجمہ ہے۔ 'دہ مجلس' کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد احمد شاہ تاجدار دہلی کے زمانے میں میر محمد حسین کلیم دہلوی نے 'فصوص الحکم' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے جو اٹاوہ کے رہنے والے تھے بسنہ ۱۷۹۸ء میں امیر خسرو کی 'چہار درویش' کو فارسی سے اردو میں 'نو طرزِ مرصع' کے نام سے منتقل کیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ عہدِ نواب شجاع الدولہ میں میر عطا حسین جنرل اسمتھ کے ہمراہ بحیثیت میر منشی عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ (گلِ رعنا مصنفہ عبدالحی)

لیکن یہ کتابیں ایسی نہیں تھیں جن کو نثر اردو کا نمونہ کہا جا سکے یا ان کے مترجموں یا مؤلفوں کو موجدِ زبان اردو قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ وہ سب کتابیں زیادہ تر فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں اور مذہبی رنگ اور قصے کہانیوں کے طرز پر لکھی گئی تھیں۔ نہ ان کی عبارت درست اور عام فہم ہوتی تھی نہ صرف و نحو کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں اور ادیبوں نے پرانی روش سے ہٹکر ایک نئی روش اختیار کی۔ ادب اردو میں ایک نیا راستہ نکالا۔ عربی، فارسی و سنسکرت کے غیر مانوس، ثقیل اور بے ترتیب الفاظ کی بجائے آسان، سلیس، سادہ، بے تکلف اور بامحاورہ الفاظ استعمال کئے درحقیقت جدید نثر نگاری کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوتی ہے اور یہاں کی مطبوعات نثر اردو کا بہترین نمونہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

میر امن دہلوی نے میر عطا حسین تحسین کی 'نو طرزِ مرصع' کو 'باغ و بہار' کا نام دے کر نئی شکل اور نئے رنگ میں پیش کیا۔ یہ اردو ادب کا سب سے پہلا طویل افسانہ یا ناول ہے۔ جو سنہ ۱۸۰۱ء میں بمقام

کلکتہ لکھا گیا۔ تحسین کے ترجمے میں فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ بہت تھے۔ اور زبان نہایت بے رنگ و پُر تکلف معلوم ہوتی تھی۔ میر امن نے ایسے بامحاورہ زبان میں لکھا۔ سلیس اردو اور اندازِ بیان کے لحاظ سے یہ کتاب بے مثال ہے دلی کی ٹکسالی زبان ہے حُسن و لطافت سے بھی مالا مال ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی ہدایت تھی کہ ساری کتابوں کی تصنیف یا ترجمہ میں زبان کی سادگی صفائی اور سلاست کا خاص خیال رکھا جائے۔ 'باغ و بہار' کے دیباچہ میں میر امن نے حسبِ ذیل وضاحت کی ہے:۔

"خداوند نعمت، صاحبِ مروت، نجیبوں کے قدردان جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

یہ زبان کی ایسی خصوصیت ہے جو اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی اور یہ گلکرسٹ کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ 'باغ و بہار' کا قصہ نہایت دلچسپ ہے اُس زمانے کے رسم و رواج، طرز و معاشرت کی تصویر نہایت دلکش انداز میں کھینچی گئی ہے۔ دیباچہ میں سببِ تالیف اور زبانِ اردو کی مختصر تاریخ بھی درج ہے یہ کتاب نہ صرف ہندوستانیوں میں بلکہ اہلِ یورپ میں بھی بیحد مقبول ہوئی اور تقسیم ہند تک کلکتہ میں انگریزوں کی نصاب میں شامل رہی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ دیسی زبان کے علاوہ

انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی، زبانوں میں بھی ہوا۔ اور ہر ملک میں بہ نگاہِ قدر دیکھی گئی۔

میر امن نے ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف "اخلاقِ محسنی" کے طرز میں ایک کتاب لکھی جس کا نام 'گنج خوبی' رکھا۔ اس کا سن طباعت ۱۸۰۲ء ہے۔ 'گلِ رعنا' میں لکھا ہے کہ میر امن شعر بھی کہتے تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔

سید محمد حیدر بخش عربی و فارسی میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ سب سے پہلی کتاب ۱۸۰۰ء میں 'قصۂ مہر و ماہ' کے نام سے لکھی تھی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے یہ کتاب بہت پسند کی اور ان کی قابلیت کے اعتراف میں اپنے زمرۂ مصنفین میں شامل کیا۔ ۱۸۰۱ء میں 'آرائشِ محفل' یعنی 'قصۂ حاتم طائی' کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اس کا ترجمہ بنگلہ، ہندی گجراتی، زبانوں میں ہو چکا ہے۔ تیسری قابل قدر تصنیف 'طوطا کہانی' ہے جس میں ابنِ نشاطی کی 'طوطی نامہ' کو جدید رنگ میں پیش کیا جو دراصل سنسکرت کی ایک کتاب 'شوکا شپتنی' سے ماخوذ ہے۔ 'طوطا کہانی' اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں مثلاً ۱۸۷۵ء میں انگریزی میں مسٹر اسمال نے ۱۸۰۶ء میں بنگلہ میں چندن چرن سیرام پوری نے 'طوطا اتہاس' کے نام سے، ہندی میں امبا پرشاد راماننے، غواصی نے دکنی زبان میں (نظم میں)، گجراتی نظم میں سمالا بھٹ نے اور مرہٹی میں کسی نامعلوم نے کیا۔

حیدر بخش نے امیر خسرو کی فارسی مثنوی 'قصۂ لیلیٰ مجنوں' کو اردو کا جامہ پہنایا۔ 'گل مغفرت' نامی کتاب بھی ان کی تصنیف ہے جس میں اولیاء اللہ کے حالات درج ہیں۔ 'چہار درویش' کو 'گلزارِ دانش' کے نام سے لباسِ اردو

میں ملبوس کیا۔ ۱۲۲۴ھ میں منشی مرزا مہدی کی 'نادر نامہ' سے 'تاریخ نادری' کا ترجمہ کیا۔ نظامی کی مشہور مثنوی کے جواب میں 'ہفت پیکر' تصنیف کی۔ یہ تصنیف ۱۸۰۵ء اور ۱۸۰۶ء یعنی دو سال میں مکمل ہوئی۔ ان کتابوں کے علاوہ چند مراثی، ایک دیوان مجموعۂ کلیات و حکایات بھی ان کی یادگار ہیں۔

میر شیر علی افسوس دہلوی

کی ایک تصنیف کا نام بھی 'آرائش محفل' ہے اس میں ہندوستان کے شہروں کے حالات بالتفصیل ملتے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ منشی سوجن رائے کی 'خلاصۃ التواریخ' کا ماخذ ہے۔ آرائشِ محفل ۱۸۰۴ء میں کلکتہ میں چھپی ۱۸۰۲ء میں 'گلستانِ سعدی' کو 'باغِ اردو' کا نام دے کر اردو زبان و ادب میں روشناس کیا۔ افسوس نے میر بہادر علی کی 'نثر بے نظیر'، منشی عزت اللہ کی 'مذہب عشق'، اور مولوی محمد اسمٰعیل کی 'بہارِ دانش' کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی۔ 'کلیاتِ سودا' بھی افسوس کی تصحیح سے منظر عام پر آیا تھا۔ افسوس کو شاعری سے بھی فطری ذوق تھا۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔ ۱۸۰۹ء بمقام کلکتہ انتقال کیا۔

میر بہادر علی حسینی

نے میر حسن دہلوی کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' یعنی قصۂ بدرِ منیر و بے نظیر کے نام سے اردو نثر میں ترجمہ کیا یہ کتاب ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۳ء دو سال میں مکمل ہوئی۔ ان کی دوسری کتاب 'اخلاقِ ہندی' بھی قابلِ ستائش ہے جو ۱۸۰۲ء میں فارسی کی مفرح القلوب سے ترجمہ ہوئی اور وہ فارسی کتاب سنسکرت کی ایک کتاب سے ماخوذ ہے۔ زبان اردو کی صرف و نحو اور فنِ عروض سے متعلق ڈاکٹر گلکرسٹ کے

لکھے ہوئے قواعد کا خلاصہ تحریر کیا۔ جو ۱۸۱۶ء میں کلکتہ میں چھپا۔ شہاب الدین تابش کی تصنیف 'تاریخ آسام' کا بھی ترجمہ کیا۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں ۱۶۶۲ء کے تاریخی حملۂ آسام کا ذکر ہے جو اورنگ زیب کے مشہور جرنیل نے کیا تھا۔ حسینی نے اس کے ترجمہ کو لرگ کی فرمائش پر کیا تھا۔ علاوہ ازیں 'قصۂ لقمان' اور 'ترجمۂ قرآن مجید' بھی ان کی اعانت سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مرزا کاظم علی جوآن دہلوی

نے کالیداس کی مشہور تصنیف "سنگھاسن بتیسی" یعنی قصۂ شکنتلا کا ۱۸۰۱ء برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ کالیداس کی اس کتاب کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۷۱۶ء میں شہنشاہ فرخ کے سپہ سالار موسیٰ خاں پسر فدائی خاں کے حسب حکم "شاعر نواز تبشیر نے کیا تھا۔ اور یہ ۱۸۰۲ء میں للولال جی کی نظر ثانی کے بعد کلکتہ میں طبع ہوا۔ قرآن شریف کا اردو ترجمہ سب سے پہلے جوآن نے کیا۔ خاندان بہمنی سے متعلق مشہور تاریخ کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ بارہ ماسہ 'دستور ہند' بھی ان کی ایک قابل قدر تصنیف ہے جس میں ہندوستان کی دو بڑی قوم ہندو اور مسلمانوں کے تہواروں، وہاں کے موسموں، اور فصلوں کا نہایت دلچسپ انداز میں ذکر ہے۔ جوآن نے 'خرد افروز' کے نام سے میر و سودا کے کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔ ۱۸۱۵ء میں فورٹ ولیم کالج کے تحت جتنے مشاعرے ہوئے۔ ان میں انہوں نے شرکت کی۔

اکرام علی

عربی زبان سے بھی متعدد کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں ان میں خاص طور پر قابل ذکر وہ ترجمہ ہے جسے اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں بغداد کے شہرۂ آفاق رسائل 'اخوان الصفا' میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ 'اخوان الصفا' کے نام سے کیا۔ یہ انسانیت و حیوانیت کے موازنے کا

اعلیٰ نمونہ ہے۔

مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء یا ۱۲۱۵ھ میں گلشنِ ہند کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ جو اصل میں مرزا علی ابراہیم خاں بہاری کی 'گلزارِ ابراہیم' کا اردو ترجمہ ہے یہ تذکرہ بعد میں مولوی عبداللہ خاں کے زیرِ اہتمام حیدرآباد دکن میں شائع ہوا۔ یہ اس لحاظ سے بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ مصنف نے اس میں اپنے عہد کے ان شعراء کے حالات لکھے ہیں جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے یا ملاقات کر چکے تھے۔ لطف فارسی میں شعر کہتے اور اپنے والد تجرے سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

مولوی حفیظ الدین نے ابوالفضل کی 'عیارِ دانش' کو موسوم بہ 'خرد افروز' کو اردو لباس سے آراستہ کیا۔ یہ سنسکرت زبان کی اُس کتاب سے ماخوذ ہے جس کا نام عربی زبان میں 'کلیلہ و دمنہ' ہے۔

مظہر علی خاں ولاؔ نے 'سنگھاسن بتیسی' کی طرح 'بیتال پچیسی' کا سنسکرت سے اردو ادب میں گرانبہا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ حسبِ ذیل مطبوعات ان کی علمی قابلیت و ادبی کاوش کی مظہر ہیں۔

۱:۔ منظوم اردو ترجمہ پندنامۂ سعدی۔ مطبوعہ ۱۸۰۲ء۔ مقامِ اشاعت کلکتہ۔

۲:۔ ہفت گلشن مصنفہ ناصر علیخاں بلگرامی واسطی کا اردو ترجمہ۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اخلاق و عادات، اقوالِ نبوی اور بزرگوں کے احترام، ادب، اطاعت و فرمانبرداری کی باتیں اس میں درج ہیں۔ جو خالص مذہبی رنگ میں ہیں۔ سنِ طباعت ۱۸۰۱ء۔

۳:- موتی رام کشیر کی برج بھاشا کو اردو زبان میں "قصۂ مادھونل و کام کنڈلا" کے نام سے منتقل کرنے کا سہرا ولاؔ کے سر ہے۔ سن تصنیف ۱۸۰۱ء۔

۴:- عہدِ شیر شاہ کی فارسی تاریخ کا اردو ترجمہ۔

مظہر علی ولاؔ کو شعر و شاعری سے بھی فطری مناسبت تھی اور بڑے بلند پایہ شعر کہتے تھے۔ مرزا جان تپشؔ اور مصحفیؔ سے استفادۂ سخن کیا۔ غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، تمام اصنافِ سخن میں بہ طبع آزمائی کی۔ ان کا ایک ضخیم دیوان "دیوانِ ریختہ"، فورٹ ولیم کالج لائبریری میں موجود ہے۔

مولوی امانت اللہ

نے ۱۸۰۱ء میں نظم میں "صرف اردو" تصنیف کی جو زبانِ اردو کے صرف و نحو سے متعلق ہے۔ ۱۸۰۴ء میں عربی اور اُردو زبان میں "ہدایت الاسلام" تصنیف کی جس کا ترجمہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے انگریزی میں کیا۔ ۱۸۰۵ء میں کپتان جیمس مونٹ کے حسب فرمائش "جامع الاخلاق" کا اردو ترجمہ "اخلاقِ جلالی" سے کیا۔ شاعری میں شیداؔ تخلص کرتے تھے۔

خلیل علیخاں اشکؔ

نے ۱۸۰۹ء میں "واقعاتِ اکبر" کے نام سے "اکبر نامہ" کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا۔

مرزا جان تپشؔ

نے اردو محاورات پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۱۱ء میں ایک طویل مثنوی موسوم بہ "بہارِ دانش" تصنیف کی۔ ایک کلیات بھی یادگار ہے۔ انھیں اردو، فارسی، سنسکرت میں بھی مہارت حاصل تھی۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ پھر ڈھاکہ (مشرقی پاکستان کی دارالحکومت) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۸۲۰ء میں وفات پائی۔ حلقۂ تلامذہ

بہت وسیع تھا جن میں بعض بہت مشہور ہوئے اور بعض شاعر گردوں میں شمار ہوئے ایسے شاعروں میں احمد بیگ تپاں، غلام حسین آتش، فرحم علی بیخود عبداللہ جنون کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ ان میں حافظ اکرم علی ضیغم نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان کا تذکرہ آگے کے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

میر علی بنگال کے رہنے والے تھے انھوں نے 'بل دی' کا قصہ موسوم بہ 'بہارِ عشق' اردو میں نظم کیا۔ یہ وہ معرکہ آرا کتاب ہے جو 'گل وصنوبر' کے نام سے چھپی مرتبہ ۱۸۲۲ء بمقام کلکتہ طبع ہوئی۔

سیرام پور مرکز اسی زمانے میں سیرام پور میں بھی بنگالی اور اردو کا ایک مرکز قائم ہوا جو فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت کر رہا تھا۔ وہاں بھی اہل علم و فضل کا اچھا خاصا گروہ جمع ہو گیا تھا۔ پروفیسر کیمری اور ولیم وارڈ کی کوششوں سے نادر و مقبول کتابوں کا بنگالی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور ۱۸۳۹ء میں بنگالی زبان پورے صوبہ میں سرکاری زبان تسلیم کی گئی۔ نہ صرف بنگلہ زبان و ادب کو ترقی ہوئی بلکہ اردو زبان و ادب کو بھی بہت عروج حاصل ہوا۔ اور اس زبان میں بھی نہایت اہم علمی و مذہبی تصانیف کا بیش بہا اضافہ کیا گیا۔ سب سے پہلے قرآن شریف کا ترجمہ یہیں ہوا۔ پادریوں کی مدد سے بائبل کا نہایت سلیس و شستہ اردو میں بھی ترجمہ ہوا۔ گو اس سے قبل بھی بنجمن شگز اور کالبرگ کی مساعی جمیلہ سے ۱۷۴۸ء میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ترجمہ مقبول نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی

لہ خطبات گارساں دی تاسی صد ۱۵۷

عبارت ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے مملو تھی۔ یونانی زبان سے ۱۸۱۴ء میں عہد جدید، کو اردو ادب میں پیش کرنے کا سہرا پادری مارٹن کے سر ہے عہد جدید کا ترجمہ بھی ۱۸۰۵ء میں پہلے کلکتہ میں چھپ چکا تھا اس کے مترجم مرزا محمد فطرت اور فورٹ ولیم کے دیگر اہل قلم تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے بھی اس پر نظر ثانی کی تھی مگر مارٹن کا ترجمہ سب سے زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوا۔ بائبل کا ترجمہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تکمیل ۱۸۱۶ء تا ۱۸۰۹ء میں ہوئی۔ بائبل کے ترجمہ و اشاعت کا اصل مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ اسی سلسلہ میں متعدد رسائل و اخبارات و کتابچے بھی شائع ہوتے رہے لیکن اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان و ادب کی کافی ترقی و ترویج ہو گئی اور اس زبان میں بہت سی مفید کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج اور سیرام پور مرکز کے تحت جو کتابیں منظر عام پر آئیں وہ دراصل عربی، فارسی، ہندی و سنسکرت، زبانوں کی رہین منت ہیں۔ جو آگے چل کر نئی نسلوں کیلئے مشعلِ راہ و مینارۂ منزل ثابت ہوئیں۔ آج انہیں خدمات کی بدولت اردو اس منزل پر پہنچی ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر جان گلگرسٹ

اس عظمت و مقبولیت کے لئے اردو زبان کو اپنے سب سے بڑے محسن و سرپرست ایک انگریز افسر کا احسان مند ہونا چاہیئے جنہوں نے اردو ادب و جدید نثر کی صحیح معنوں میں داغ بیل ڈالی۔ اُن کی زیر نگرانی اردو کی عظیم الشان خدمات

انجام دی گئیں۔ یہ انگریز افسر ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے وہ خود انگریزی کے ایک جلیل القدر ادیب ہونے کے علاوہ فارسی و اردو میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے دارالخلافہ اڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ اڈنبرا کے جارج ہیریٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹری سے انہیں بچپن سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اپنے ہی شہر کے ایک میڈیکل ہسپتال میں علم طب کی تکمیل کی ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت ڈاکٹر ملازم ہوئے اور کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ گلکرسٹ کو نہ صرف علوم مشرقیہ بلکہ مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ کلکتہ میں انہوں نے بیک وقت فارسی، سنسکرت، اردو زبانوں کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی۔ دیسی زبان سے ان کی واقفیت کا قصہ بجید دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ دہلی اور لکھنؤ جیسے مقامات میں جہاں اردو صحیح اور بامحاورہ بولی جاتی ہے۔ دیسی کپڑوں میں ملبوس وہاں کے شہروں اور گلیوں کی سیر کیا کرتے وہاں کے باشندوں سے ربط و ارتباط پیدا کرتے۔ اور ان کی زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح اپنی فطری ذہانت اور ذاتی کوششوں سے فارسی و اردو پر قدرت حاصل کر لی تو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ لارڈ ویلزلی نے جو اس وقت گورنر جنرل ہند تھے ان کی قابلیت سے بجید متاثر ہو کر فورٹ ولیم کالج کے عہدۂ افسر اعلیٰ پر فائز کیا۔ کثرت کار کے باعث ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ اور پنشن لے کر ۱۸۰۴ء میں ولایت چلے گئے۔ زبانِ اردو سے انھیں اتنی محبت تھی کہ اپنے وطن اڈنبرا میں بھی سول سروس کے اُمیدواروں کو اس زبان کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی

نے زبان اردو کی تعلیم کی غرض سے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ کا سنگِ بنیاد رکھا تو وہاں کے پروفیسر مقرر ہوئے ۱۸۲۵ء میں انسٹی ٹیوٹ بند ہو جانے کے باوجود انگریزوں کو تادم آخر پرائیویٹ طور پر اردو کی تعلیم دیتے رہے لیکن کسی حال میں بھی بنگال کو نہ بھولے۔ بنگال سے ان کی بے پناہ محبت اور اردو کی بے لوث و ناقابلِ فراموش خدمت کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے۔ کہ وفات سے پیشتر انھوں نے اڈنبرا یونیورسٹی کے نام ایک وصیت کی کہ ان کی جائداد سات ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی سے تین وظائف مقرر کئے جائیں اور یہ ہندوستان کے اُن طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دیئے جائیں جو بنگال۔ مدراس یا بمبئی کے ہوں۔ گلکرسٹ ۸۲ سال کی عمر میں ۱۸۴۱ء بمقام پیرس عالمِ جاودانی کو سدھارے۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کی فہرست تصانیف حسب ذیل ہے۔

۱:۔ اُردو کی ایک جامع لُغت بہت مشہور ہے۔ نو سال میں تیار ہوئی اس کی یہ خصوصیت بھی قابلِ تعریف ہے کہ اِس میں نہ صرف الفاظ کے معنی بتائے گئے ہیں بلکہ ہر لفظ کی اصل بھی واضح کی گئی ہے۔

۲:۔ ' ہندوستانی علم اللسّان ' ، انگریزی واردو الفاظ کے بالتفصیل معنی درج ہیں۔ اردو کی عام بول چال پر بھی عالمانہ تبصرہ ہے۔ قواعدِ زبان اردو کے متعلق بھی ایک مفید مقدمہ شامل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن گپتان ٹامس آ ذیک کی زیرِ نگرانی ترمیم و اضافہ کے بعد اڈنبرا سے شائع ہوا۔

۳:۔ اُردو کی ' صرف و نحو ' ، اور فنِ عروض سے متعلق گلکرسٹ کی زندہ جاوید کتاب ہے۔ اسے دراصل علم اللسان کا تیسرا ایڈیشن کہنا

چاہیئے۔ یہ عہدِ برطانیہ تک فورٹ ولیم کے نصاب میں داخل رہی۔

۴:- ہندی کی آسان مشقیں، کے نام سے ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی۔ جو کالج کے ابتدائی اُمیدواروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اس کی زبان سہل اور آسان ہے۔

۵:- فارسی زبان کا جدید نظریہ، اس میں افعال پر بحث کی گئی ہے اور ان کے صحیح و جائز استعمال بتائے گئے ہیں۔

۶:- مشرقی زباندان، اس میں اردو زبان میں ہتھیاروں کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ شروع میں اردو زبان کی تاریخ پر ایک مختصر سا مضمون مقدمہ کی شکل میں شامل ہے۔

۷:- بیاضِ ہندی، اس میں فورٹ ولیم کالج کے تمام مصنفین کی تحریروں کے نمونے ہیں۔ یہ انتخاب ۱۸۰۳ء میں کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے اُس زمانے کے مصنفین کے طرز تحریر اور خصوصیات نثر کا اندازہ ہوتا ہے۔

۸:- اجنبیوں کے لئے رہنمائے اردو، انگریزوں کے کم سے کم وقت میں اردو سیکھنے کے خیال سے یہ کتاب لکھی تھی۔ سنِ اشاعت ۱۸۰۲ء ہے۔

۹:- عملی نمونے، اردو الفاظ کے صحیح تلفظ اور ادائیگی پر ایک مختصر لیکن مفید کتابچہ ہے۔

اردو کی ترقی و ترویج، توسیع و اشاعت اور غیر ملکیوں کو تعلیم دینے کی غرض سے گلکرسٹ نے اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں مکالماتِ ہندی و عربی، ہندوستان گو، اتالیقِ ہندی، مشرقی حصہ

ہندی، عربی، آئینہ وغیر قابل ذکر ہیں۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فرماتے ہیں — "حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا۔ اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے[1]۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کے علاوہ اور چند انگریز افسروں کی خدمات سلسلۂ زبان اردو قابل ستائش ہیں۔ ان میں کپتان روبک، کپتان ٹیلر، ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریکوں سے ایک انقلابِ عظیم رونما ہو گیا ایک طرف ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں ذوقِ شعر و ادب نشوونما پانے لگا تو دوسری طرف اخبارات و رسائل و جرائد منظرِ عام پر آنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس زمانے میں اردو کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھ گئی تھی۔ کہ علماء کو اس زبان میں تصنیف و تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے ۱۲۲۳ھ میں قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ کیا۔ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین نے تحت اللفظ ترجمہ کیا۔ ان کے بھتیجے مولانا محمد اسمٰعیل نے اپنی کتاب "ردالاشراک" کے باب اول کا ترجمہ اردو میں "تقویۃ الایمان" کے نام سے کیا[2]۔ مشرقی بنگال میں اردو زبان کے شیدائی۔ مولوی کرامت علی نے مذہبی و اصلاحی موضوعات پر بیشتر مفید کتابیں لکھیں۔ بنگالی رسم الخط میں

---

[1] اردو ادب صفحہ ۵۴

[2] گلِ رعنا مصنفہ عبدالحی

اردو نظمیں بھی عام رواج پا گئیں گرچہ وہاں کی تصانیف نظم و نثر میں عربی و فارسی کے الفاظ نظر آتے ہیں لیکن یہ الفاظ غیر مانوس نہیں۔ بلکہ وہی ہیں جو جو دیسی زبان میں رائج ہو چکی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی خدمات کی بدولت اردو نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی بلکہ دلی اور لکھنؤ کے درو دیوار سے گزر کر بہار و بنگال کی سرسبز و شاداب وادیوں تک پہنچ گئی۔ قیام فورٹ ولیم کالج سے قبل۔ بنگالی میں فارسی و اردو۔ امراؤ شرفاء کا اوڑھنا بچھونا اور ان کی محلسوں کا طرۂ امتیاز تھیں۔ خصوصاً کلکتہ کے علاوہ نوابانِ ڈھاکہ و مرشد آباد نے نہ صرف فارسی و اردو ادب کی سرپرستی کی بلکہ اپنے اپنے عہد کے شعراء و ادباء کو جس عنایت و ثروت سے نوازا۔

محمد فقیہہ دردمند نواب علی وردی خاں کے زمانے میں ایک مشہور بنگالی اردو شاعر کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا نام محمد فقیہہ اور تخلص دردمند تھا۔ دردمند نواب موصوف کے دربار کے ممتاز شاعر تھے۔ مرزا جان جاناں مظہر سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ۱۷۶۰ء میں انتقال ہوا۔

نواب سراج الدولہ کو فارسی و اردو سے بڑی دلچسپی تھی وہ خود بھی عالم تھا۔ اور اہل علم کی دل سے قدر کرتا۔ اس نے بھی علم و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں نامی گرامی شعراء کو شرف باریابی حاصل تھا۔ جن میں قدرت اللہ قدرت اور فرحت اللہ فرحت زیادہ مقبول ہوئے۔ یہ شعرائے دلی و لکھنؤ میر۔ سودا۔ آبرو۔ حاتم۔ تاجی۔ وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ جو اٹھارویں صدی کے اوسط میں

گذرے سب کے سب اہلِ دیوان تھے۔

قدرت

مؤلف "تاریخِ ادب اردو" لکھتے ہیں کہ شاہ قدرت اللہ قدرت پر شمس الدین فقیر کے برادر عمزادے تھے اور اغلب ہے کہ ان سے مشورۂ سخن بھی کیا ہے۔ لیکن عبد الغفور خاں نساخ نے "تذکرۂ سخن شعراء" میں لکھا ہے کہ قدرت مظہر جان جاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ قدرت نے خان آرزو کو بھی اپنا کلام دکھایا تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے محمد شاہ کے زمانے میں نوابانِ مرشد آباد کی قدر دانی کی شہرت سنکر مرشد آباد چلے آئے تھے اور یہیں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میر نے قدرت کو "عاجز سخن" کا لقب دیا ہے حالانکہ میر حسن ان کے بڑے مداح تھے۔ اور کلام کی یوں توصیف کی ہے "سمندِ نظمش در میدان فارسی و ہندی چالاک، و چستی و تصویرِ بے نظیر معانیش در استخوان ہندی الفاظ درست بندہ دیروکیب بار در شاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام" مرزا علی لطف نے بھی کلام قدرت کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ قدرت کا نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ؎

اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابر تر آیا ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا

تیر بیداد جدھر رخ کرے گھر اس کا ہے سینہ اسکا ہے دل اسکا ہے جگر اسکا ہے

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ
گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے
گر میسر ہو تو کسی عشرت سے کیجئے زندگی

اس طرف آوازِ طبل اور دہر صدائے کوس ہے

کل تو قدرتؔ پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا

آج رہن جام مئے یہ خرقۂ سالوس ہے

قدرتؔ کے زمانے میں اور کئی مشہور مرثیہ گو و مرثیہ خواں شعراء نے بھی محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد حکومت میں دہلی چھوڑ کر مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی ان میں میر سوز، مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ محمد خاں شہاب جنگ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

انشاءؔ

اکثر ارباب ذوق اس بات سے ناواقف ہیں کہ میر انشاء اللہ خاں انشاءؔ جیسے ظرافت و مزاح نگار شاعر کی روح نے خاک بنگال کو پسند کیا۔ انشاء مرشد آباد میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد کے زیر نگرانی زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوئے۔ بچپن سے شعر کہتے تھے۔ شروع میں اپنے والد سے مشورہ کرتے تھے۔ جب سن شعور کو پہنچے تو وہیں سے شاہ عالم بادشاہ دہلی کے دربار سے منسلک ہوئے۔ دلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے جہاں وزیر سعادت علیخاں نے نہ صرف ان کی دادِ سخن دی بلکہ بہر طور قدر بھی کی[1]۔

صفدرؔ

مرشد آباد میں انشاءؔ کے والد میر ماشاء اللہ خاں شاہی طبیب تھے جو زوال دہلی کے بعد دہلی سے یہاں آگئے تھے۔ ماشاء اللہ شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے اور ان کا تخلص صفدرؔ تھا۔

---

[1] انشاءؔ ـــــ متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء ـ نمونۂ کلام اور مفصل حالات کے لئے دیکھو: تاریخ ادب اردو، صفحہ ۱۷۹ تا صفحہ ۱۹۱

شرف جنگ پلاسی کے بعد مرشد آباد کی محفل لٹ گئی۔ اہل قلم حضرات ادِھر اُدھر منتشر ہونے پر مجبور ہوئے۔ میر جعفر کے دور میں نواب میر محمد شرف مشہور شاعر ہوئے۔ شرف کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ غالباً میر جعفر کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ نواب سید جعفر خاں صوبیدار مرشد آباد سب کے سب تلف ہو گئے۔ ان کی ایک رباعی زبان زد عام ہے جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے۔ یہ رباعی ان کی خوشحالی زندگی کی آئینہ دار ہے ؎

قزاق نہیں کہ لوٹ لاتے ہیں ہم
مزدور نہیں کہ روز پاتے ہیں ہم
کیا پوچھتے ہو یارو حقیقت اپنی
اللہ دیتا ہے بیٹھے کھاتے ہیں ہم

زبان کی روانی اسلوب بیان کی صفائی قابل داد ہیں۔

آشنا نام میر امیر علی۔ تخلص آشنا۔ میر سبز مرشد آبادی کے بیٹے اور غلام حسین آتش کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک قطع ہے ؎

مجھ کو تو بات کل کی نہیں یاد آشنا
کہتے ہیں روز حشر کو دینا حساب ہے

ثریا والاجاہ آسمان قدر سید اسد علی مرزا بہادر، امیر الامرا نواب منصور علی خاں بہادر نواب ناظم بنگال کے چشم و چراغ اور نواب ناظم مرشد آباد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم مرشد آباد میں اور اعلیٰ تعلیم انگلستان میں اپنے برادر والا قدر نواب امیر حسین علی خاں نواب بہادر۔ مرشد آباد کے ساتھ حاصل کی۔ انگلستان سے واپس آکر مرشد آباد میں کم اور کلکتہ میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ کئی ہزار روپے ماہوار۔ نیز وثیقہ وظیفہ سرکار سے ملتا تھا ذوقِ شعر و سخن خداداد تھا، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

میری وفا اور انکی جفا ہے عجیب راز
ہے داد رس کوئی نہ کوئی داد خواہ ہے

ٹھوکر لگا کے تم کہے گر غیرتِ مسیح | لبیک کہہ کے آؤں میں باہر مزار کے

ہزار دل آندھیاں آئیں پسِ مرگ | نہ اُٹھی خاک پر مجھ ناتواں کی

مٹایا اس طرح آخر فلک نے | نہ رکھی خاک تک مجھ بے نشاں کی

یہاں رہتا ہے جلوہ نورِ حق کا | جگہ دل میں نہیں عشقِ بتاں کی

اِن کے علاوہ مرشد آباد میں لاتعداد شعراء و ادباء گذرے ہیں۔ کتاب کی ضخامت کے خیال سے سب کا تذکرہ یہاں ممکن نہیں۔ دوسری والیوم (Volume) میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔
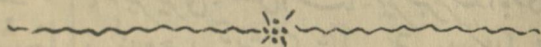
دوسرا دور

۱۸۲۵ء تا ۱۸۷۵ء

بنگال میں اردو شاعری کا عروج

تمہید پہلا دور، کے باب سے واضح ہے کہ وہ دور نہ صرف بنگال بلکہ سارے ہندوستان میں نثر کی ترقی کا دور تھا۔ زیر نظر باب میں اس امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ دور بنگال میں اردو شاعری کے عروج کا دور تھا یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف انشاء اللہ خاں انشاء اور قاضی محمد اختر اپنی ضیائے فکر سے دربار اودھ کو منور کر رہے تھے تو دوسری طرف بنگال کی ادبی انجمنیں پرگو شاعروں کی شمع تخلیقات سے

جگمگا رہی تھیں ۔ غدر ۱۸۵۷ء کی بادِ خزاں سے دہلی اور لکھنؤ کے گلستانِ
سخن اُجڑ گئے۔ واجد علی شاہ[۱] معزول کر کے لکھنؤ سے کلکتہ لائے گئے تو وہ
نہ صرف اپنے ہمراہ لکھنوی مذاقِ سخن اور سرمایۂ زبان لائے بلکہ اپنے تمام
خوشہ چیں اہلِ علم و فضل کو بھی ساتھ لے آئے جن کے ذوقِ شعر و ادب
نے مٹیا برج (جو کلکتہ کے قریب ہے) کو لکھنؤ کا ایک نمونہ بنا دیا۔ اس
زمانے میں بنگال کے ہر چہار طرف شعر و سخن کا کافی چرچا رہا۔ مرزا نواب
خاں۔ داغ دہلی سے اور نظم طباطبائی دکن سے کلکتہ آئے اور وہاں کے
مشاعروں اور ادبی محفلوں میں برابر شرکت کی۔ بنگال کے مختلف مقامات
میں عبدالغفور خاں نساخ، شہباز، محمود آزاد، و محمد آزاد وغیرہ جیسے
اکابرین مخفی و ماہرینِ ادب کے علاوہ اور بہت سے باکمال شعراء و مایۂ
ناز انشاء پرداز موجود تھے۔

اختر

انشاء کی طرح اور کئی مقبول شاعروں نے بنگال کی
فضائے شعر و ادب میں پرورش پائی اور لکھنؤ کی
محفلِ ادب کو حیاتِ جاوداں بخشی ان میں انشاء کے بعد قاضی
محمد صادق خاں اختر خلف قاضی محمد لعل کا نام نامی نمایاں طور
پر نظر آتا ہے۔

اختر کی جائے پیدائش ہگلی ہے۔ فارسی کے مستند
استاد مرزا قتیل کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اختر کی فصاحت و
بلاغت اور حسنِ کلام نے غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کو بہت

۱؎ واجد علی شاہ اور ان کے خوشہ چیں شعراء کے تذکرے ایک علیحدہ
باب کی شکل میں آگے پیش کئے جائیں گے۔

جلد اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ انہیں درباری شعراء میں ایک درجۂ امتیاز کے ساتھ ساتھ خطاب "ملک الشعراء"[1] بھی عطا ہوا۔ ان کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے جرائد میں عموماً "شاعر بے بدل" کے لقب سے شائع ہوا کرتا تھا۔ مصحفی، جرأت اور انشاء وغیرہ کے ہمراہ اکثر مشاعروں میں شرکت کی۔

علامہ رضا علی وحشت کلکتوی اپنے ایک قابل قدر مقالہ میں رقمطراز ہیں:

"اختر بیشتر فارسی کہتے تھے اور اردو میں بھی شعر روانی کے ساتھ موزوں کرتے تھے۔ ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں کا زمانہ تھا۔ اور دہلی میں ذوق و غالب و مومن۔ ان کے ہمعصر تھے۔ اختر نے ایک تذکرہ موسوم بہ "آفتاب عالمتاب" لکھا تھا۔ جس میں پانچ ہزار فارسی شعراء کا حال اور کلام ملتا ہے اور جس سے نواب صدیق حسن خاں کو "شمع انجمن"[2] کی تالیف میں بڑی مدد ملی تھی۔ غازی الدین حیدر کی توصیف میں ایک کتاب موسوم بہ "مطلع العلوم و مجمع الفنون" کی تالیفات سے ہے۔ یہ فارسی میں لکھی گئی تھی اور منشی نولکشور نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا[3]۔ گلدستۂ محبت[4] جس میں گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے۔ "مثنوی سراپا سوز" "صبح صادق خود نوشتہ سوانح عمری۔ دیوان فارسی۔ بہار بیخزاں، بہار اقبال، گنج نیرنگ

[1] واجد علی شاہ اور ان کے خوشہ چیں شعراء کے تذکرے ایک علیحدہ باب کی شکل میں آگے پیش کئے جائیں گے۔

[2] تذکرہ شمع انجمن، مرتبہ نواب صدیق حسن خاں (۱۲۹۲ھ)

[3] تذکرہ سخن شعراء۔ مرتبہ مولوی عبدالغفور خاں۔ نساخ۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۵ء

[4] تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ۔ مطبوعہ منشی نولکشور لکھنؤ۔

ہفت اختر اور ایک دیوان ریختہ ان کی یادگار ہیں۔

قاضی اختر کو واجد علی شاہ جان عالم پیا اختر کے استاد سخن ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ واجد علی شاہ نے انعام واکرام کے عوض یہ تخلص اختر قاضی اختر سے خرید لیا تھا[1]۔ جب واجد علی شاہ ان سے ناراض ہوگئے تو وہ لکھنؤ چھوڑ کر اٹاوہ چلے گئے۔ اور وہیں ۱۸۵۸ء میں وفات پائی[2]۔

کسی زمانے میں ان کا مندرجۂ ذیل قطعہ زبان زد خاص و عام تھا۔ جس سے اختر کا کمالِ فن بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کل شیخ بن کے مجتہد عصر سا تپا
دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا

کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں مینا شراب کا

میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا
پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا

مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش
اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بیحجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

منت سے پھر کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت بھی سلام کروں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

کلام کا رنگ وہی ہے جو ان کے لکھنؤ اور دہلی کے معاصرین کا تھا۔

---

[1] تاریخ ادب اردو۔

[2] تذکرہ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں رحلت کی اور تاریخ ادب اردو میں درج ہے کہ اٹاوہ میں۔ حقیقت کا علم اللہ کو ہے۔

اختر کی کچھ غزلیات اردو، فارسی کا ایک قلمی نسخہ علامہ وحشت کے پاس موجود ہے۔

لکھنؤ اور غازی الدین حیدر کے زمانے کا لکھنؤ غریب سے کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ کہتے ہیں ؎

چاہتے ہیں جائیں بنگالے کو ہم دامن فشاں
پر کریں کیا لکھنؤ کی خاک دامنگیر ہے

کلام فارسی ؎

آہ جانسوز کہ در سینۂ من شعلہ کش است	اب چراغیست بہ بالین مزار دلِ من
خط برآورد و ی و ذیشانی ہنوز	پیشوائے سادہ رویانی ہنوز
گرچہ از خط صبح حسنت شام شد	جانِ اختر ماہ تابانی ہنوز

ضیغم غدر کے بعد جن شعراء نے بنگال میں شہرت حاصل کی ان میں سید حافظ اکرام احمد ضیغم سب سے زیادہ نامور استاد گذرے ہیں۔ پیشہ طبابت تھا۔ شعر و شاعری سے فطری ذوق رکھتے تھے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں میرؔ، سوداؔ و نسیمؔ کے ہمعصر تھے۔ بنگال کے معاصرین میں خواجہ عبدالرحیم صباؔ۔ خواجہ فیض الدین شائقؔ تلمیذ غالبؔ وغیرہ جیسے سخن سنج موجود تھے۔ مرزا جان تپش کی طرح وہ بھی آخری عمر میں رام پور سے ڈھاکہ تشریف لے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ ضیغم نے شاہ رؤف احمد رافت سرہندی شاگرد جرأت سے اکتساب فن کیا۔

ضیغم اردو و فارسی کے صاحب دیوان تھے۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ریختہ و مرثیہ میں خاص ملکہ تھا۔ بنگال میں انھوں نے بہت سے لائق و فائق شاگرد چھوڑے۔ جن میں عبدالغفور خاں بہادر نساخ، سید محمود آزاد

عبداللہ آشفتہ، حکیم اشرف علی مست۔ خواجہ عبدالغفار اختر۔ حافظ رشید الٰہی وحشت، راجہ نمونی متراران سپہر ادب کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ محمود آزاد نے ایک شعر میں ضیغم کی مکمل تعریف کی ہے ؎

کاملِ فنِ سخن ماہر اصنافِ کلام
کوئی ضیغم مناظر مجھ کو نہ استاد آیا

نسّاخ غدر یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد لارڈ میکالے کی تجویز سے انگریزی زبان کو عربی و فارسی کی جگہ ترجیح دی جانے لگی۔ مسلمانوں کی انتہائی بدبختی تھی کہ انھوں نے پہلے پہل اسی سات سمندر پار کی زبان کو اپنانے میں "اسلام کو خطرے میں" محسوس کیا۔ کسی نے اس کے سیکھنے والوں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا کسی نے اس کے حامیوں کو "دشمن اسلام" قرار دیا۔ کسی نے روایتی توہین تصور کیا اور جانے مذہب کی آڑ میں کیا کیا۔ گلہائے رنگا رنگ کھلائے گئے۔ آفریں ہے اُن دُور اندیش۔ ذی فہم و باعث نفوس پر جنہوں نے انگریزی کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے سیکھی عوام میں ان اجنبی و غیر مانوس زبان کی توسیع و اشاعت اور تعلیمی بیداری کی کوششیں کیں ایسی بلند ہستیوں میں سرسید احمد خاں کی طرح بنگال میں حاجی محمد محسن، نواب عبدالطیف اور ان کے بھائی خاں بہادر۔ ابو محمد عبدالغفور خاں نسّاخ کے نام بڑی عزت اور احترام سے لئے جاتے ہیں۔ صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ اردو کی ترقی میں بھی نسّاخ کا بہت کچھ حصہ ہے۔ اُردو سے ان کی بے پناہ محبت اور غیر معمولی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

نسّاخ کے والد ماجد قاضی فقیر محمد کلکتہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ وکیل تھے۔ علم و ادب سے بھی خاص شغف تھا۔ ان کی ایک تاریخ فارسی زبان میں موسوم بہ "جامع التواریخ" ۱۸۹۷ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

نساخ کی پیدائش مشرقی بنگال کے ایک ضلع فرید پور میں ۱۲۴۹ھ میں ہوئی۔ شیفتہ، نیر، مجروح، حالی، داغ، امیر وغیرہ کے ہمعصر اور حافظ ضیغم کے قابلِ فخر شاگرد تھے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کا تبادلہ بہار اور بنگال کے مختلف مقامات میں ہوتا رہا۔ جہاں کہیں بھی گئے شاعری و صلاحیت کا لوہا منوایا اور دو چار شاعر بنا آئے۔

جب ان کا پہلا دیوان "دفترِ بے مثال" زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا تو غالب نے اپنے حسبِ ذیل مکتوب میں تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"جناب مولوی قبلہ، یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ مکرمتِ حال کا شاکر اور آئندہ افزائشِ عنایت کا طالب ہے۔ دفترِ بے مثال، کو عطیہ کبریٰ اور موہبیت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائش کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچمند ان کو قابلِ خطاب اور لائق عطائے خطاب جانا۔ ہیں دروغ گو نہیں خوشامد میری خو نہیں۔ دیوانِ فیضِ عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔ "دفترِ بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، خیال بلند، مضمون عمدہ، بندش دلپسند، ہم فقیر لوگ اعلانِ کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ نساخ ہیں۔ تم دانۂ رموزِ اردو زباں ہو۔ سرمایۂ نازشِ قلمرو ہندوستان ہو۔"

ایک طرف مرزا غالب کے زبان و بیان سے لطف اندوز ہوئیے تو دوسری طرف ایک بنگالی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ فرمائیے۔

متعدد تالیفات و تصانیف نساخ کے یادگار ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور، زندہ جاوید اور قابل قدر ان کا تذکرہ موسوم بہ "تذکرۂ سخنِ شعراء" ہے جو ۱۲۹۱ھ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ تذکرہ اس اعتبار سے خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ اس میں ان کے معاصرین کا بھی ذکر ہے اور بنگالہ کے اکثر شعراء داد بار جن کا ذکر کہیں نہیں ملتا اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ ایک تذکرہ اپنے ہمعصر فارسی گو شعراء کا بھی ترتیب دیا تھا۔ جس کا نام "تذکرۃ المعاصرین" ہے اس تذکرے سے کچھ دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ سرسید احمد خاں فارسی شعر کہتے تھے اور آہنی تخلص کرتے تھے۔ سرسید کے فارسی اشعار کے علاوہ داغ دہلوی، امیر لکھنوی کے فارسی کلام کا نمونہ بھی اس میں ملتا ہے۔ نساخ کی تالیفات میں ایک مجموعہ مختلف شعراء کے فارسی کلام کا ہے اس کا نام۔ "قندِ پارسی" ہے۔ ایک تصنیف موسوم بہ "گنج تواریخ" ہے اس میں لوگوں کی تاریخِ وفات بشکل قطعہ یا ادبیات لکھی گئی ہے۔ ابتدائے سن ہجری سے لے کر سنہ ۱۲۹۰ھ تک اُن کی اُردو غزلیات چار دیوان پر مشتمل ہیں۔ دیوان چہارم مسمیٰ بہ نام تاریخی "ارمغانی" (سنہ ۱۳۰۲ھ) ہے اس دیوان کے سر ورق پر ان کی دیگر تصانیف کے نام مرقوم ہیں جیسے: زبانِ ریختہ، قطعہ منتخب، انتخابِ نقص، مظہرِ معمار، چشمۂ فیض، شاہدِ عشرت، مرغوبِ دل، اشعارِ نساخ، ارمغاں، ترانۂ خامہ، باغِ فکر مصرِ دت، قطعاتِ نساخ، سوانح عمری نساخ وغیرہ۔ "طومارِ اغلاط" میں لکھنؤ کے چند مشہور شعراء مثلاً آتش، ناسخ، امیر، وزیر، صبا، منیر وغیرہم کے کلام پر اعتراضات ہیں اعتراض اپنی جگہ پر مستحکم ہیں۔ آتش کا شعر ہے ؎

یار کی تصویر کھنچوائی تو کہتا ہے وہ شوخ
قالبِ بیجان کے منظور پیراہن میں ہے

۱؎ مقالاتِ وحشت از خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی۔

یار اور شوخ سے اگر ایک ہی شخص مراد ہے تو دو لفظ لانے کی ضرورت نہ تھی بس اس سے عجز طبیعت کا حال کھلتا ہے۔

اعتراضات بر کلام ناسخ۔

جب دہان یار دیکھا گورِ تنگ آئی نظر
نارِ دوزخ یاد آئے زلف پیچاں دیکھ کر

دہانِ یار گورِ تنگ، کیا عمدہ تشبیہ ہے!

اعتراضات بر کلام امیر لکھنوی

ڈری یہ رات کو میری سیاہ بختی کی ظلمت سے
دعائے نور پڑھ کر اپنے اوپر شمع نے دم کی

دعائے نور کیا؟ شاید سورۂ نور کو بسبب ردیف (کی) دعائے نور کہا ہے۔ واہ رے ایجاد!

اس چمن میں طائرِ کم پر اگر ہوں میں تو کیا
دور ہے صیاد ابھی اور آشیاں نزدیک ہے

لفظ 'کم پر' نے مرغ فصاحت کے پر لگا دیئے کہ اُڑ بھاگا۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ ناسخ نے اپنا یہ تخلص ناسخ لکھنوی کے جواب میں اختیار کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ چونکہ اہل لکھنؤ کا اپنے زبان دکلام پر زعم انھیں پسند نہ تھا اور ان کے کلام پر لکھنؤ والوں نے بہت سے اعتراضات کئے تھے ناسخ نے بھی اس کے جواب میں اہل لکھنؤ کے کلام پر اعتراضات کئے۔ لیکن یہ سلسلہ بند نہ ہوا بلکہ ناسخ کے اعتراضات کے بعد بھی ان کے کلام پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہی۔ ایک بزرگ آغا علی نام ساکن لکھنؤ مدرس مدرسۂ عالیہ محمود آباد نے ناسخ کی بری طرح خبر لی ان کے

اعتراضات کی ایک مثال ان کی کتاب مسمّیٰ بہ "تفضیح" سے نقل کرتا ہوں۔

دھواں ہے زلف اور شعلہ ہے عارض
تماقدرواں شمع رواں ہے

یہ سرو رواں پر قیاس فرماکر شمع رواں۔ ایجاد فرمائی گئی ہے۔ اس وقت تک تو شعرائے زبان اردو نے شمع رواں کو تکلیف نہیں دی تھی۔

نساخ نے میرزا دبیر کے کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی جو اپنی جگہ دلچسپ اور مفید ہے۔

میر انیس کے متعلق یہاں تک کہدیا کہ "سوائے مرثیہ کے اور کسی صنف سخن میں مطلق دخل نہیں رکھتے بلکہ مرثیہ بھی ان کا ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو۔"

نساخ نے فریدالدین عطار کے 'پندنامہ' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ خاقانی ہند ذوق کے کلام کا جواب بھی لکھا ہے۔

نساخ امام الشعراء کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان کے چند اشعار چھٹے دیوان "ارمغانی" سے پیش کئے جاتے ہیں۔ بقول علامہ وحشت "نساخ ناسخ و آتش کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے"۔ اسے رنگِ قدیم کہا جا سکتا ہے[۵]

دھوم ہے میری نکتہ دانی کی	کی صفت ان کی بے دہانی کی
اب کہاں شوخیاں جوانی کی	حسرت عمر رفتہ ہے دل میں
اب کہاں دھوم لن ترانی کی	ساری باتیں تھیں میرے ہی دم تک

کوئی اعجاز ہے یا ہے یہ کرامت تیری
بن گئی لب پہ مرے شکر شکایت تیری

تو نے رسوائی مگر نام اسی کا رکھا

میرے باعث جو ہوئی خلق میں شہرت تیری
مر گئے غالب و آزردہ رہا ہے اک تو
ذاتِ نساخ بہت اب ہے غنیمت تیری
نادان تھا دل اپنا جو تجھ پہ آگیا تھا
تو بے دفا ہے یہ تو میں خوب جانتا تھا

نساخ کے زمانے میں بنگال کے مختلف مقامات میں واجد علی شاہ اختر اور ان کے خوشہ چیں کے علاوہ اور کئی باکمال شعراء موجود تھے۔ طوطا کہانی کے مشہور مصنف سید محمد حیدر بخش حیدری، اور رمز چاٹگام شاہد فرید پور، منظوم مالدہ، اعظم و معراج کلکتہ کے رہنے والے تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور شاعر شاہ الفت حسین فریاد تھے۔ ان کا وطن مرشد آباد تھا۔ مگر کلکتہ میں سکونت پذیر تھے۔ تاریخ نادری ان کی نادر تصنیف ہے۔ ان کے شاگردوں میں عبدالودود اوحد ایک بلند پایہ سخن سنج تھے۔ وفات کے بعد دیوان طبع ہوا۔ جس کی تعریفیں امیر مینائی اور داغ دہلوی جیسے استادانِ فن نے کیں۔ اوحد کو شاعرانہ طبیعت قدرت کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد متخلص بہ واحد فارسی کے خوش فکر شاعر تھے ان کے خاندان کے دو افراد شاداں اور ناطق چوٹی کے شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔

نساخ کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا جن میں شمس، آزاد، نسخ، حمید، ضیا، مرحبا، قوس، موج، سکور، مسرور، طالب الاپچی رام امرتسری، مصطفےٰ حیدر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا شمار انیسویں صدی کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔

کامل نصیر الدین ہاشمی نے "مدراس میں اردو" صفحہ ۱۸۱ میں کامل کے متعلق یہ چند سطریں لکھی ہیں :- "غلام کبریا نام اور کامل تخلص ۱۲۱۱ھ میں بنگال سے مدراس آئے اور یہاں اقامت کر لی۔ عربی فارسی اور اردو میں شعر کہا کرتے طوطی بنگال کے لقب سے مشہور تھے"

احمد نام آقا احمد علی تخلص احمد۔ ان کے جدِ امجد ایران کے باشندے تھے۔ دادا آغا عبد العلی خوش نویس خطاط تھے۔ پدر بزرگوار شجاعت علی جن کا تاریخی نام مظہر علی تھا۔ ۱۰ رشوال ۱۲۵۵ھ میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے شعر کہتے تھے اسد اللہ کوکب جیسے عالم و فاضل شاعر کے دامنِ فیض سے وابستہ تھے۔

آقا احمد علی فارسی و اردو کے ایک بلند پایہ شاعر اور اپنے عہد کے چوٹی کے انشاء پرداز تھے۔ ان کی قابلیت کا اعتراف غالب جیسے یگانۂ روزگار سخنور نے کیا ہے۔ شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کے قدر دان تھے۔ ۱۸۶۲ء میں وطن ڈھاکہ چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ اور وہاں فارسی و عربی علوم و فنون کی ایک درسگاہ موسوم بہ "مدرسہ احمدیہ" قائم کی۔

تصانیف حسب ذیل ہیں :-

۱:- مؤید برہان۔ ۱۸۶۵ء میں طبع ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں غالب کے رسالہ "برہانِ قاطع" پر جو اعتراضات کئے گئے تھے۔ یہ کتاب اُن اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ جس کے متعلق غالب نے کہا تھا ؎

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ	در خصوص گفتگوئے پارسی انشا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی آبا چہ سود	خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

'برہان قاطع' پر اعتراضات کے جواب میں ہندوستان کے کئی نامور اہل قلم نے رسالے لکھے جن میں سعادت کی "محرق" مرزا رحیم بیگ میرٹھی کی "ساطع برہان" مشہور ہیں۔ مگر 'مؤید برہان' ان سب میں عدیم المثال ہے۔

۲ :۔ "شمشیر تیز تر" ۱۸۶۸ء میں مرزا غالب کی "تیغ تیز" کے جواب میں شائع ہوئی تھی۔ آقا احمد کی یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے اور بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔ تذکرہ 'مؤید برہان' اور 'شمشیر تیز تر' کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔

مندرجہ بالا دو کتابیں احمد کو بحیثیت شاعر، محقق، اور ناقد زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

۳ :۔ 'ترانہ' میں ان کی فارسی رباعی کی تاریخ اور اس کے اوزان ہیں۔ ان کے ایک شاگرد "بلوخمین" نے ۱۸۶۷ء میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔

۴ :۔ اشتقاق" اس مختصر سی کتاب میں فارسی کے صرف و نحو پر بحث کی گئی ہے۔

۵ :۔ "ہفت آسمان" ان کی آخری تصنیف ہے جس میں مثنوی کے سات اوزان کی شرح ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے دسمبر ۱۸۷۳ء میں اس کا ایک باب 'آسمان اول' کے نام سے شائع کیا۔ چند مثنویوں کے عنوانات مندرجۂ ذیل ہیں۔

"مثنوی دیس و رامین ہیں"۔ "سکندرنامہ، نظامی، اقبال نامہ جہانگیری، مآثر عالمگیری، منتخب التواریخ بدایونی، اکبرنامہ ابوالفضل وغیرہ۔

احمد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس بھی رہے - ہفت آسمان، کے آخری حصے میں اپنے بعض شاگردوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے جن میں محمود آزاد، محمد اشرف، عبدالعلیم عاصم اور فدا سلہٹی قابل ذکر ہیں۔

آقا احمد نے جون ۱۸۷۳ء ڈھاکہ میں رحلت کی۔ نساخ نے تاریخ وفات کہی :-

"واصلِ حق آغا احمد"

آزاد نواب سیّد محمود المتخلص بہ آزاد عرف منجھلے صاحب - سیّد اسلا الدین حیدر کے بیٹے اور خان بہادر سیّد علی مہدی کے پوتے تھے۔ ان کے پردادا امیر اشرف علی ایران سے ڈھاکہ آگئے تھے۔

محمود آزاد کا سنِ ولادت ۱۸۴۳ء بمقام ڈھاکہ - اور سنِ وفات ۱۹۰۷ء (بعمر ۶۵ سال) ہے - آزاد اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے۔

ابتدائے شاعری میں شیدا تخلص کرتے تھے۔ مشہور مزاح نگار اور نامور نامہ نگار "اودھ پنچ" سیّد محمد آزاد کے بڑے بھائی تھے۔

شروع میں آقا احمد علی احمد اصفہانی باشندۂ ڈھاکہ کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے۔ پھر اکرام احمد ضیغم کے چشمۂ فیض و عنایت سے مستفید ہوئے۔ مرزا غالب سے آزاد کے تعلقات خاص تھے - یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ غالب کے شاگرد

بھی تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) اپنے ایک[1] مقالہ میں رقمطراز ہیں:۔

"شرف صاحب[2] کا بیان ہے کہ آزاد مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ آزاد کا یہ دستور تھا کہ تقریباً ہر سال وہ دہلی جاتے تھے اور دو تین مہینے وہاں قیام کرتے تھے اور اس سفر کی غائت مرزا غالب سے ملاقات اور ان کی صحبت سے استفادہ ہوتی تھی۔ جب تک مرزا غالب زندہ رہے آزاد برابر دہلی جاتے رہے حکیم محمود خاں دہلوی، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مجروح اور حالی سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ ان بزرگوں سے تعلقات خاص تھے۔ جس زمانے میں مرزا غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ آزاد بھی ان سے ملنے کلکتہ گئے تھے۔ غرض مرزا غالب کے ساتھ وہ غیر معمولی دلچسپی اور ارادت رکھتے تھے"۔

آزاد کا دیوان ۱۸۸۹ء میں ان کے دوست مولوی مہدی حسن خاں شاد آب کے زیر اہتمام مطبع المطابع عظیم آباد سے شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ اورنگ آباد کالج کے پروفیسر عبدالغفور شہباز مرحوم نے نہایت دلچسپ انداز بہ زبانِ فارسی قلمبند کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ علامہ وحشت کے ذاتی کتبخانے میں موجود ہے جو بڑی خستہ حالت میں ہے اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۳ صفحے کے دیوان میں کل ۱۳ غزلیں اور پانچ رباعیاں اردو کی ہیں اور باقی صفحات فارسی کلام سے بھرے پڑے ہیں۔ جس سے یہ انداز

---

[1] "مشرقی پاکستان کے اردو ادیب" [2] سید شرف الحسینی شرف مصنف گلستان شرف محمود آزاد کے بھانجے ہوتے ہیں ڈھاکہ کے یادگار سلف بزرگ اور باکمال شاعر ہیں ان کا تذکرہ عصر حاضر کے باب میں ملاحظہ کیجئے۔

کرنا مشکل نہیں کہ ان کی طبیعت فارسی گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ انھیں مرزا غالب کی طرح اپنے فارسی کلام پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ فرماتے ہیں ؎

آزاد نظم ریختہ کچھ میرا فن نہیں
واقف ہیں فارسی کے مرے شعرِ تر سے آپ

مرزا غالب کا اپنے اردو کلام کے مقابلہ میں فارسی شاعری کے متعلق یہ نظریہ ہے ؎

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

علامہ وحشت اپنے ایک گرانقدر مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آزاد فارسی کی طرف زیادہ مائل تھے اور اس زبان میں اہلِ زبان کی سی لطافت پیدا کی ہے۔ پر زور قصائد خاقانی اور عرفی کی زمینوں میں کہے ہیں۔ غزلیں بھی خوب کہی ہیں۔ ایک پُر زور قصیدہ میں جو خاقانی کے مشہور قصیدہ: "دل من پیر تعلیم است و من طفلِ زباندانش" کی زمین میں لکھا ہے۔ اپنے کو فیضی قرار دیا ہے اور بھائی کو ابو الفضل۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بنظم و نثر ام وزادہ ابوالفضل است و من فیضی
بہ دادِ پایہ سنج من ہنم از نکتہ فہمائش

کلام فارسی کے چند اشعار بطور نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں

اپنے وطن ڈھاکہ کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ہمایوں خطۂ مینو سوادے دلکشا شہرے
کہ باشد رہ کشِ گلزار جنت ہر بیابانش

مبارک مرز بوے جانفزا جائے طرب خیزے
که آمد خوشتر از صبح وطن شامِ غریبانش

ز تاثیر ہوا و آب جاں بخش و رواں پرور
فراغ از فیضِ انفاسِ مسیح و آبِ حیوانش

ز جان آسائیٔ شام و مسرت زائیٔ صبحش
بجاں شامِ ہرات و صبح نیشاپور قربانش

ایک قصیدہ "حمد باری تعالیٰ" کی شوکتِ الفاظ اور معانی کی دلنشینی ملاحظہ فرمایئے ؎

اے ذات تو از شائبۂ شرک مبرّا
برہانِ وجودِ تو زہر ذرہ ہویدا

انوارِ جمالت بکمال انجمن افروز
آثارِ وجودت بوجوب آئینہ پیرا

گل پوش ز حمد تو سر صفحۂ دیوان
پُر نور ز نامِ تو رُخِ دفتر انشار

نطق از شرفِ نسبتِ حمد تو مباہی
اندیشہ بہ نیروی ثنای تو توانا

سرگشتۂ صحرائیٔ خیالِ تو تجسس
وارفتۂ سودائیٔ وصالِ تو تمنا

مندرجۂ بالا اشعار سے آزاد کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ امر قابل ستائش ہے کہ آزاد نے فارسی شاعری کی نسبت

اردو میں بہت کم اشعار تھے۔ لیکن اس کم سخنی کے باوجود اردو کلام متانت فصاحت، بلاغت، زور، روانی، پختگی، نشست الفاظ کی ترکیب اور مضمون آفرینی سے مملو ہے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر انہیں نہ صرف فارسی بلکہ اردو شاعری میں بھی ممتاز مقام حاصل ہے۔ آزاد نے غالب، ذوق، مومن کی زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہیں۔

غالب کی زمین پر کتنا پُر زور مطلع کہا ہے ؎

شیوۂ پرسشِ احباب ستم ہے ہم کو
کیا کہیں ہائے کسی شوخ کا غم ہے ہم کو

بیخودیٔ شوق کی اور عرضِ تمنا ان سے
نہیں معلوم کہ منہ سے مرے کیا کیا نکلا

آجائے میکدے میں واعظ تو سیر ہو
منبر پہ ہیں دھرے ہوئے کسی کر و فر سے آپ

انکار سے برا یہ ہے اصرار آپ کا
گویا کہ ٹالتے ہیں بلا اپنے سر سے آپ

آزاد خان بہادر نواب سید محمد آزاد خلف سید اسدالدین حیدر۔ ولد خان بہادر سید مہدی علی ابن میر اشرف علی ایرانی، نواب سید محمود آزاد کے چھوٹے بھائی اور ڈھاکہ کے صاحب جاہ و ثروت رئیس تھے ۱۸۳۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں عمر کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گذرا اور غالباً ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔

آزاد انیسویں صدی کے اوسط کے نامور، مقبول ترین انشا پردازوں مثلاً اکبر الہ آبادی، منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی جوالا پرشاد برق، منشی تربھوناتھ ہجر اور مرزا مچھو بیگ عاشق "ستم ظریف" کے ہمعصر تھے۔ اُن حضرات سے آزاد کے تعلقات دوستانہ تھے۔ اُس زمانے کے تقریباً تمام رسالوں اور اخباروں میں آزاد کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں :-

اودھ پنچ، آگرہ اخبار، آگرہ، دوربین دہلی، اکمل الاخبار دہلی، شیر قیصر لکھنؤ اور انگریزی اخبار "دی ٹیمس اینڈ رعیت" کلکتہ۔ انگریزی اخبار میں جو مضامین شائع ہوئے وہ ان کی انگریزی دانی اور مغربی ادب سے واقفیت کے شاہد ہیں۔

آزاد کے نام کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے "اودھ پنچ" لکھنؤ جسے ۱۸۷۷ء سے منشی سجاد حسین نکالتے تھے، کے فائلیں کافی ہیں۔ "اودھ پنچ" اُس زمانے میں ہر دلعزیز اخبار تھا۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس اخبار کی کامیابی و دلچسپی کا باعث صرف محمد آزاد کی نرالی اور دلنشیں تحریریں تھیں اُس کے لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی اور دوسرے متذکرہ بالا بہترین انشاء پرداز تھے جن میں آزاد کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

آزاد کا نام کم از کم بحیثیت نامہ نگار اودھ پنچ دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہیگا۔

"نئی ڈکشنری" کے عنوان سے جنوری ۱۸۸۶ء سے "اودھ پنچ" میں ایک نہایت دلچسپ اور جدت طراز ظرافت آمیز سلسلہ شروع کیا

کیا تھا جس کے تحت ہر سال نئے نئے الفاظ کے معانی مع تشریح و تفصیل کے سمجھاتے تھے چند الفاظ ' خیالات آزاد ' سے نقل کئے جاتے ہیں :-

" پالیسی ۔ آنر ۔ انٹرسیٹ ۔ پارٹی فیلنگ ۔ سولیزیشن ۔ فیملی ایجوکیشن کورٹ شپ ۔ کانشنس ۔ پارلیمنٹ ۔ سائنٹفک ۔ فرانٹیر ، فالنگر ، ترم ساں اولڈ پاپا ، مہذب بی بی ۔ موچی ۔ ڈ دمن ۔ الکشن زادہ ۔ آیا ۔ اڈریا بہرہ میاںجی ۔ پیرائی ۔ وغیرہ "

آزاد کی تحریر میں طنز و مزاح کے تیر و نشتر بھی ہیں اور زبان وادب کی حلاوت و چاشنی بھی ۔ صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے علاوہ انھوں نے جس جدت و ندرت اور شگفتگی ۔ رعنائی و بے ساختگی کے ساتھ تراکیب الفاظ ۔ محاوراتِ زبان ، نادر اصلاحات ۔ رنگین تشبیہات اسلوب ظرافت کو عطا کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں ۔

آزاد کے مزاحیہ مضامین کو یکجا جمع کئے جائیں تو کئی ضخیم کتابیں تب ہو سکتی ہیں ۔ ایک مجموعہ موسوم بہ ' خیالاتِ آزاد ' پہلی دفعہ ۱۸۸۶ء میں قومی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ۔ دوسرا ایڈیشن دیگر مضامین کے اضافہ کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں محمد عبد الحمید ۔ حمید کے زیر اہتمام رضوانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا ۔ اس کا ایک نسخہ محترمی ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ اس کے علاوہ اور چند کتابیں مثلاً سوانح عمری آزاد ، نوابی دربار وغیرہ بھی زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ کر مقبولِ خاص و عام ہوئیں ۔

' خیالات آزاد ' میں پروفیسر عبد الغفور شہباز[۵] کا مختصر سا دیباچہ شامل ہے جو نہایت دلچسپ ، مفید اور معلومات افزا ہے ۔ نیز محمد آزاد

---

[۵] شہباز کا مفصل حال آگے کے صفحات میں لکھا جائیگا ۔

کے طرزِ تحریر، مقبولیت۔ تحریر اور کتاب کی افادیت پر بھی روشنی پڑتی ہے شہباز لکھتے ہیں۔

عالم انشاء پردازی پر اس شخص کا اس قدر احسان ہے شاید ہی کوئی انشاء پرداز ایسا ہو گا جس کے قلم سے اتنے مختلف نو ایجاد رنگوں میں اتنی مقبول اور دل پسند تحریریں نکلی ہوں۔ اس مجموعے میں جس قدر تحریریں ہیں شوخی و ظرافت آمیزی میں وہ بھی کم نہیں۔

بہت سے ڈرامے جو اس شخص کے قلم جادو رقم سے مختلف اخلاقی مضامین پر نکلے اور متانت کے مضامین اس میں بالکل دبے ہی نہیں گئے۔"

اسی دیباچہ کے صفحات میں پروفیسر شہباز ایک جگہ اور رقمطراز ہیں۔

"شوخی و ظرافت جو اس شخص کا ایک خلقی جوہر ہے وہ بھی اس آزادی کے زمانے میں بے چمکے نہ رہی اور اس کی چمک دمک اس غضب کی ہوئی کہ اکثر خیرہ چشم گھبرائے اور بہت سے صاحب نظر چکر میں آئے۔ اکثر مجالس میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے فقرات نقل محفل بنے اور اکثر زبانوں پر ان کے بعض برجستہ جملے ضرب المثل کی طرح جاری ہوئے۔ جدت پسندی سے مضمون آفرینی کا جو رستہ نکلا، ایسا نکلا جس پر لوگ قدم بھی بمشکل رکھ سکتے ہیں۔ منزلِ مقصود کو پہنچنا تو بڑی بات ہے اور ساتھ اس مشکل پسندی کے عام پسند اس قدر کہ ہر شخص اس پر والہ و شیدا۔ سب سے پہلے ڈکشنری کی ایجاد کی۔ اس رنگ نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے اور اکثروں نے جوشِ پسندیدگی میں اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن آخر وہی مثل ہوئی کہ "بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا۔"

خیالات آزاد، کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات خطوط کے لئے وقف ہیں۔ یہ خطوط آزاد کی شوخی و ظرافت، رنگِ خاص اور محض طرزِ تحریر کے آئینہ دار ہیں۔ جو نہایت پُر کیف پُر لطف اور دلچسپ و دلکش ہیں یہ خوبی بھی قابل تعریف ہے کہ انداز تحریر نہایت شوخ بے تکلف اور رنگین ہونے کے باوجود طنز و مزاح کا کوئی فقرہ یا ٹکڑا کہیں ناہموار مخرب اخلاق یا خلافِ تہذیب نہیں بلکہ جو فقرہ ہے نہایت چیت و مہذب۔ جو ٹکڑہ ہے نہایت بامحاورہ اور تہذیب و اخلاق کے لئے سبق آموز و عبرتناک۔ جو عبارت ہے دلکش جو مضمون ہے اعلیٰ صنائع کا بہترین نمونہ۔

یہ واقعہ ہے کہ آزاد نے سرزمین بنگال میں آنکھیں کھولیں اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ ولایت اور یورپ تو کیا غالباً دہلی و لکھنؤ کے علاوہ کہیں اور جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اُن کے وہ فرضی خطوط جو ایک ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان نے ولایت سے بھیجے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں بیٹھ کر لکھے گئے۔ اور اُس نوجوان نے وہاں کے حالات و کوائف ماحول و فضا سے متاثر ہو کر اپنے سچے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ آزاد کی یہ خصوصیت تحریر نہ صرف باعثِ حیرت ہے بلکہ ان کے کمالِ فنِ انشاء پردازی پر دال ہے۔ جس کی مثال ادب اردو میں خال خال ہے۔ بطور نمونہ خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"مائی ڈیر عفت بیگم! میرا پہلے پہل بسم اللہ مجریہا و مرسیہا کہہ کر دریائے فراق میں کشتی ڈالنا اور بندر بمبئی سے جہاز

دُخانی پر چڑھا کہ تمھاری فرقت مجھ پہ سوار ہوئی - اکثر راتوں کو جہاز میں تمھارے گیسوئے مشکیں، موباف سرخ اور گرئی ململ کے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا - مگر جب سے اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا روز بروز صدمۂ مفارقت گھٹتا گیا اور دردِ جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی اب بخدا تمھاری محبت اسی قدر اور اسی طرح مجھے ہے جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا کی - پیارے جانور کی محبت اور زیادہ ہوتی ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمھاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمھاری حالت کا جب میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو بالکل ایک نیم وحشی چارپایہ بن کر میرے دیدۂ تصور کے سامنے آتی ہو اور میں اس بات سے نہایت پچھتاتا ہوں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی کیوں نیم وحشی گوشت کے داعیٔ عیش و آرام و پرورش کا میں ضامن ٹھہرا واقعی اس سے زیادہ بدنصیب دنیا میں کوئی نہیں جو اس مردم سوز خطۂ غیر مہذب ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں -

کوہ قاف، سبز پری، لال پری، زرد پری، نیلم پری، پکھراج پری، کے قصے لڑکپن سے سنا کرتا تھا اور ان قصوں کو خیالی باتیں جانتا تھا - مگر تمھاری جان کی قسم پریوں کا ملک یہی ہے یہاں کی عورتیں آزادی کی ہوا کھا کر جیتی ہیں - ہر قسم کی تعلیم پاتی ہیں - ہر مجلس و محفل میں بے تکلف جاتی ہیں - گاتی ہیں بجاتی ہیں - ناچتی ہیں - ہر قسم کے مردوں کو خوش کرتی ہیں عمدہ سے عمدہ شرابیں پیتی ہیں - ہوائی گاڑیوں (بگھی) میں بیٹھتی ہیں سواریوں پر سیر کو نکلتی ہیں - لباس صاف پریوں کا سا ہے "

شائق | نام خواجہ فیض الدین عرف حیدر جہاں تخلص شائق مولد و مسکن شہر ڈھاکہ۔ باپ کا نام خواجہ خلیل اللہ

سرزمین بنگالہ میں جن ارباب ذوق کو مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی جیسے یگانۂ روزگار استاد کے دامن فیض سے وابستگی کا فخر حاصل تھا۔ ان میں نواب سید محمود آزاد کی طرح حیدر جہاں شائق بھی ایک تھے۔ گو شائق کو محمود آزاد کی طرح دہلی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن بذریعہ ڈاک اپنی غزلیں اور نظمیں بھیجدیا کرتے اور مرزا غالب بڑے شوق و محبت سے ان کی اصلاح فرماکر واپس کردیا کرتے تھے۔ شائق نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان میں بھی شعر کہنے کے شائق تھے فارسی میں اکثر کلام غالب کا تتبع کرتے۔ غالب نے ان کے فارسی کلام پر بھی اپنی اصلاح دی ہے۔ شائق صاحب دیوان تھے۔ بطور نمونہ از خروارے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔ بقول ناسخ۔

"اشعار ان کے پر درد ہوتے ہیں" [1]

اسی نے کیا ہم کو رسوائے عالم — کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
یہاں نالۂ بے اثر ہم کو بخشا — وہاں دل ترا سنگِ خارا بنایا
دیا نہ رد ہم کو وہ گر دوں نے شائق — کہ تدبیر جس کی نہ چارا بنایا
جسکی ٹھوکر سے جی اٹھے مردے — اس کی رفتار نے ہمیں مارا
خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں — دل لگانے کا مزا پاتے ہیں
تیرے دھوکے سے چمن میں اکثر — سرو کو جاکے لپٹ جاتے ہیں

---

[1] "تذکرہ سخن شعراء"

شہباز | پروفیسر سیّد محمد عبد الغفور متخلص بہ شہباز ساکنِ کلکتہ بنگال کے اُن چند اہلِ علم و فضل نفوس میں سے تھے جن کی قابلیت اور خدمات کا اعتراف زمانے کی بے قدری کے باوجود ان کی زندگی ہی میں کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ کے مشہور اخبار "دارالسلطنت" اور "اردو گائیڈ" میں مستقل طور پر ان کے علمی، ادبی، مذہبی و دیگر موضوعات پر معرکہ آرا مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اُن کی نظمیں بھی کلکتہ اور ڈھاکہ کے مختلف جرائد کے علاوہ ہند و پاک کے دیگر رسائل و اخبارات میں بھی آیا کرتی تھیں ایسے اخباروں میں "اودھ پنچ لکھنؤ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

بیک وقت کئی زبانوں انگریزی، اردو، بنگلہ، فارسی اور عربی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی بنگال کے قابل ترین انگریزی دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مشرقی ادب سے جس قدر متاثر تھے وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن مغربی ادب سے بطور خاص استفادہ کیا تھا اور اس ادب کی بعض مفید چیزیں اردو ادب میں شامل کیا۔ انگریزی کے مشہور شاعرِ فطرت، ولیم ورڈزورتھ کے اس خیال کی تائید میں کہ "حقیر سے حقیر یا معمولی سے معمولی موضوع بھی شاعر کے لئے باعثِ اظہارِ خیال بن سکتا ہے اسے نظر انداز کرنا شانِ شاعر کے منافی ہے۔ چنانچہ شہباز نے بھی انگریز شاعر ہی کی طرح ایسے موضوعات مثلاً مکھی، مکڑی، جلیبی، وفادار کتا، ڈکشنری وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی اور بڑے کمال کے ساتھ کامیاب رہے۔ خشک سے خشک موضوعات پر بھی نظمیں کہیں اور شعریت حسنِ بیان

لطفِ زبان کی خوبیوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

شہاب کے نواسے سید اختر حسین اختر[1] ایم۔اے انکم ٹیکس افیسر (حال ڈھاکہ) نے ان کی بعض نظموں کو سنہ ۱۹۴۲ء یعنی دوسری عالمگیر جنگ کے ہلاکت خیز و انسانیت سوز زمانے میں حاجی محمد عبد القیوم تاجر کتب ولیسلی اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں شہباز کی ان نظموں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے متعدد موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ "تفریح القلوب" اس مجموعہ کا ایسا نام ہے جو پوری کتاب کے دیباچہ کا حکم رکھتا ہے یعنی گلہائے رنگا رنگ کا ایک ایسا پر بہار، حیات بخش، زندگی آمیز، مسرت خیز اور سبق آموز گلدستہ ہے جس کے پڑھنے سے واقعی تفریح قلب اور شگفتگی روح محسوس ہوتی ہے۔ دیباچہ سر شیخ عبد القادر مرحوم بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر مخزن لاہور۔ اور پروفیسر علامہ رضا علی وحشت جیسے نقادانِ ادب و اکابر سخن نے لکھ کر اس کتاب کی اہمیت میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

شہباز کا ایک قابل قدر کارنامہ جوان کی انگریزی دانی کا ثبوت ہے ایک عدیم المثال انگریزی نظم "آبشار ڈور" کا کامیاب ترجمہ ہے۔ یہ مغرب کے مشہور شاعر سد۔ے کی نہایت زبردست مقفٰی نظم ہے۔

ان کی وہ دلاویز نظمیں جو "اودھ پنچ" میں شائع ہوتی تھیں۔ خیالات شہباز کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے کتابی شکل میں چھپ کر ارباب

---

[1] اختر حسین اختر بھی عصر حاضر کے جواں سال شاعروں میں ممتاز ہیں۔ زبان و ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ بہت کم کہتے ہیں مگر جو کچھ کہتے بہت سوچ سمجھکر کہتے ہیں افسوس ان کے مزید حالات و عزم دستیاب نہ ہونے کے باعث شریکِ اشاعت نہ ہو سکے۔

نقد و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "زندگانیٔ نظیر"
جس میں نظیر اکبرآبادی کے حالات و کلام پر فاضلانہ تبصرہ ہے۔ شائع ہو چکی ہے
علمی قابلیت کے باعث بنگال سے دکن بلائے گئے جہاں مدت دراز
تک علم طبعیات کے پروفیسر رہے۔
شہباز نثر بھی لکھتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے دونوں کا مقصد بلند و اعلیٰ
ہے۔ ان کا کلام متعدد اصنافِ سخن مثلاً نظم، غزل، مسدس، مخمس، قطعات
رباعی وغیرہ پر حاوی ہے۔ رباعیاتِ شہباز رباعی کہنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے
رباعیوں کا مجموعہ زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ فرسودہ خیالات
اور پامال مضمون سے ان کا کلام پاک ہے۔ رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے بعض
مغربی استعارات و تشبیہات کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا ہے ایک شعر
اور ایک رباعی بطور نمونۂ کلام پیش کرتا ہوں ؎

شعر۔
قول سے پہلے ہے اثر مطلوب
آہ سے پہلے ہے اثر کی تلاش

رباعی۔

کیونکر کوئی اسرارِ الٰہی جانے — کیا تاب کہ انسان کماہی جانے
آنکھوں سے حجاب ہم اٹھنا معلوم — باتیں یہ خدا کی ہیں خدا ہی جانے

اختر

ناسخ نے تذکرۂ سخن شعرا میں آختر کے متعلق یہ چند سطریں
سپرد قلم کی ہیں۔

"خواجہ عبدالغفار رئیس اعظم شہر ڈھاکہ خلف خواجہ عبدالغفور مرحوم،
شاگرد حافظ اکرام احمد ضیغم متوطن کشمیر، ان کا مولد و مسکن ڈھاکہ۔ اشعار فارسی
و اردو خوب کہتے ہیں۔ راقم کے دوستوں میں ہیں۔ یہ شعر اس تذکرے کے واسطے

بھیجے تھے ؎

حیرت ہے اس کے آنے پہ کیا پیش کش کروں

سینے میں دل رہا ہو نہ جاں اپنے تن میں ہے

پھولا ہوا خوشی سے ہر اک گل ہے اے نسیم

کس نو بہارِ حسن کی آمد چمن میں ہے

شمع روشن نہ سیہ خانۂ عاشق میں ہوئی

جلوہ گر وہ نہ ہوا کلبۂ اخزاں میں کبھی

ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے ایک مقالہ میں رقمطراز ہیں۔

"عبدالغفار اختر مرحوم نہ صرف نثر نگار تھے بلکہ مشاق شاعر بھی۔ ریختی میں اختر اور ریختی میں نزاکت تخلص کرتے تھے۔ مرزا غالب کے آخری حصۂ عمر میں ان کا عنفوانِ شباب تھا۔

داد غالب بھی تجھے دیں گے زباندانی کی

لے کے اختر جو یہ دلّی میں غزل جائے گا

اس مقطع کی بدولت مرزا مرحوم سے شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا نثر میں بھی کئی قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ اختر وہی ہیں جو خواجہ نواب احسن اللہ شاہین کے ماموں اور استادِ سخن مشہور ہیں۔"

اختر نے نزاکت کے تخلص سے جو ریختیاں کہی ہیں ان کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

آخری ہے چار شنبہ میں نئی تیاریاں

جاتی دریا پر نہانے دیکھو لے سواریاں

ؔلہ مشرقی پاکستان کے اردو ادیب

گھولتی بیسن ہے کوئی تسلے میں کوئی کھلی
کھولتی ہے کوئی اپنے کپڑوں کی الماریاں

زعفراں کوئی لئے ہے ہاتھ میں کوئی شہاب
ہو رہی ہیں چار سو ہر رنگ کی گلکاریاں

آئی ہیں گنو ہیاں الہی جان و آبادی یہاں
جمع اس جانب ہوئی ہیں کتنی آفت ماریاں

شفتلیں یہ ہیں نگوڑی شوخ اس درجہ کہ ہیں
کس کو طاقت ہے یہاں انکی کرے جو خواریاں

بس نزاکت ریختی میں تو بھی ان ہی کی طرح
خوب دکھلانے لگی ہے اپنی اب پُرکاریاں

نیک ساعت ہے دعا کو ہاتھ اٹھا خالق سے کہہ
یا خدا تو اپنی رحمت کی دکھا دے باریاں

صبا اس دور میں خواجہ عبدالرحیم صبا بھی نامور شعراء میں سے تھے۔ "سخنِ شعراء" میں ان کے حسبِ ذیل حالات ملتے ہیں۔

"صبا تخلص خواجہ عبدالرحیم خلف الرشید خواجہ سلیم اللہ داماد و برادر زادہ خواجہ علیم اللہ مرحوم رئیس اعظم ڈھاکہ۔ ہر دو زبان میں شعر خوب کہتے ہیں۔ راقم کے دوستوں میں ہیں۔ یہ شعر اس تذکرے کے لئے دیئے تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں انتقال کیا۔

جائیے آپ اس گلی میں صبا
ہم یہیں سے سلام کرتے ہیں

دزدیدہ ان نگاہوں کے مضموں کا فیض ہے
سب کو گماں جو سرقہ کا میرے سخن میں ہے

جو کہ دیکھا خواب ہے اور جو سنا افسانہ ہے
اس سے یہ ثابت ہوا دنیا تو اک غم خانہ ہے
واں ہے عذرِ آخرش مستانہ آنے میں اُسے
اور یہاں لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہے
دیکھ کر کثرت دلوں کی تار تارِ زلف میں
آئینہ حیرت میں ہے اور کشمکش میں شانہ ہے
یہ تو ہو مضموں وہ عاشق زہے نیرنگِ عشق
ایک ہی آتش سے جلتی شمع اور پروانہ ہے

شیدا خواجہ عتیق اللہ شیدا عرف شہزادے صاحب خلف خواجہ عبدالمنان، خواجہ احسن اللہ شاہین کے سمدھی اور خواجہ علیم اللہ کاشمیری کے عزیز تھے۔ شیدا وسیع امن امیر نہایت بلند اخلاق، مرنجانِ مرنج انسان اور اخلاص و مروت کے مجسمہ۔ دوست نوازی، مہمان نوازی۔ غریب پروری اور علم دوستی میں عدیم المثال تھے۔ علم و ادب، سفر و موسیقی سے فطری دلچسپی تھی۔ اردو فارسی۔ انگریزی زبانوں کے ادب پارہ سے خاص شغف تھا اور اہل علم و فضل کی قدر دانی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ تمام اصنافِ سخن میں اِن کا کلام موجود ہے ہندی بحروں اور ہندی اوزان میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔
شیدا ایک اچھے انشاء پرداز بھی تھے۔ اور مشہور ناول نگار بھی ان کا شہرت یافتہ ناول "عبرت" دہلی اور لکھنؤ جیسی زبان کی خصوصیت کے لحاظ سے ایک شاہکار ہے۔ بطور نمونہ اس کی آخری سطریں ملاحظہ فرمائیے :-

اس قصے سے سب کو یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ برے کاموں کا نتیجہ برا ہوتا ہے بے سمجھے بوجھے لوگوں سے دوستی کرنا اور اس پر اعتماد بھی عقل و دانش سے بعید ہے۔ اگر غلام پیر صاحب ان باتوں کا خیال کر کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ کر لیتے تو اتنا نقصان اٹھاتے نہ مقدمہ کی زحمت۔ حدیث نبوی ہے کہ پہلے مشورہ کرو پھر عمل۔ اس طرح انشاء اللہ کوئی خطا ہوگی نہ غلطی۔"

شیدا نے کئی جاسوسی ناول بھی لکھے۔ ان میں "دیوی چودھرائین" اور "خدا کی شان" میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو کامیاب ناول میں ہونی چاہیئں۔ انھوں نے سنتر سال کی عمر میں ۱۹۲۸-۲۹ء میں بمقام ڈھاکہ قضا کی۔

شیدا کے چھوٹے بھائی جو بھولے صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار تھے ان کے مختلف افسانے اس دور کے رسائل و جرائد میں شائع ہوا کرتے تھے۔

اشرف خواجہ محمد اشرف خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل پاکستان کے خسر تھے مشہور انشاء پرداز اور ناول نویس۔ ان کا ایک ناول "خوبیٔ قسمت" کے نام سے بہت مشہور ہے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے

آشفتہ تذکرۂ سخن شعرا" میں آشفتہ کے حسب ذیل حالات و نمونۂ کلام شامل ہیں:۔

"آشفتہ تخلص۔ حاجی منشی عبد اللہ باشندۂ سلہٹ، خلف عبد الحمید، شاگرد حافظ ضیغم۔ فارسی اردو دونوں خوب کہتے ہیں۔ راقم کے دوستوں میں ہیں ؎

دیکھنا شوقِ شہادت عاشقِ دلگیر کا
کیا تڑپ کر چوم لیتا ہے گلا شمشیر کا
تبرکی کیوں بناتے ہیں عبث حیران ہوں
کیا تنِ بے جاں کو بھی ہے حوصلہ تعمیر کا
آجکل مائل اِدھر ہے دل بتِ بے پیر کا
یہ اثر کب تھا الٰہی نالۂ شبگیر کا
وادیٔ وحشت میں ایسا پاؤں پھیلا ہے مرا
دیدۂ غول بیاباں حلقہ ہے زنجیر کا
منشی عبدالرحیم آشوب ان کے قابل ترین شاگرد اور حکیم حبیب الرحمن ان کے نوجوان دوست تھے۔

عیش نام مرزا احمد عسکری۔ تخلص عیش۔ ان کے والد ماجد مرزا علی نقی دہلی کے رہنے والے تھے اور مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈھاکہ میں شہر امن تھے۔ عیش قدرت اللہ قدرت کے تلمیذ ارشد تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

بات اب امتحان پر آئی　　قصہ کوتاہ جان پر آئی
ہے دل کو میرے راہ ترے دل سے خبردار
لگ جائے مبادا نہ کہیں دل پہ دل آتش
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ مئے ساقی　　ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اے چرخ　　لیجیو مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش ہے تصدق سوز　　مجھ سے ہوتی ہے انصرام کہیں

تمکین

نام مولوی غلام خاں تخلص تمکین ۔ والد کا نام خان بہادر مولوی غلام رسول جو تحسین تخلص کرتے تھے اور اردو فارسی ہر دو زبانوں میں شعر کہتے تھے۔
تحسین صدر الصدور ضلع ڈھاکہ کے رہنے والے تھے ۔ ان کا کلام زیادہ تر ظریفانہ اور مزاحیہ ہوتا تھا۔
غلام خاں تمکین صدر میں ضلع بیربھوم (مغربی بنگال) میں اقامت پذیر تھے۔ شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا ۔ کلام ریختی سے بھرا پڑا ہے۔ ناسخ سے دوستانہ تعلقات اور خاص مراسم تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں رحلت کی ۔ نمونہ کلام ؎

لن ترانی کے سوا اس کی زباں پر کچھ نہیں
اس ستمگر نے سنا ہے جب سے قصہ طور کا

کوئے جاناں کم نہیں کعبہ سے عاشق کے لئے
دید حق سے کم نہیں دیدِ رُخ نیکوئے دوست

لاف کرتی ہے اب اس چشم سے بیجا نرگس
کھیئے اُن آنکھوں کے آگے ہے بھلا کیا نرگس

مہرباں ہم پہ بھی ہے اور جفا کار بھی ہے
لطف اور پیار بھی ہے قصۂ تکرار بھی ہے

تمنا

نام اور حالات معلوم نہ ہو سکے ۔ تمنا کے نام سے مشہور تھے ۔ کلکتہ کے رہنے والے تھے ۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے ؎

صبا یہ کہنا خدا بچالے فقط ہیں اب آخری سنبھالے
گذرتے ہیں ناز اٹھانے والے جو دیکھنا ہو تو آکے دیکھو

تیسرا دور

۱۸۷۵ء تا ۱۹۱۰ء

شمس النسخ اور خالد کا زمانہ

تمہید یہ وہ دور تھا جب لکھنؤ میں وزیرؔ، رندؔ، صباؔ کے پیرو کثیر جماعت میں موجود تھے۔ داغؔ نہ صرف اپنی زندگی بلکہ شاعری کے بھی آخری دور سے گذر رہے تھے۔ ان کی استادی کا لوہا منوایا جا چکا تھا۔ بنگال کے گوشہ گوشہ میں ان کے شاگرد موجود تھے۔ ناسخؔ، محمود آزادؔ ضیغمؔ، قدرتؔ وغیرہ کے شاگردوں کا دور دورہ تھا۔ واجد علی شاہ اخترؔ اور ان کے دامنِ فیض و ثروت سے وابستہ شعراء۔ علماء و فضلاء کے چشمہ فیض سے صدہا سخن فہم و سخن سنج بنگال کے طول و عرض میں پیدا

ہو چکے تھے۔

مٹیا برج اور کلکتہ کی گلی گلی میں لکھنوی مذاق رس بس چکا تھا۔ یہاں تک کہ عوام کی بول چال، علمی مجلسوں، ادبی محفلوں میں بھی لکھنوی تہذیب، تمدن زبان اور محاورے اپنا رنگ جما چکے تھے۔ خصوصاً بنگال کے شعراء و ادباء بیساختہ طور پر لکھنؤ کی شیرینی و لطیف زبان بولنے کے عادی نظر آنے لگے اور ان کی تحریر و تقریر میں بھی لکھنؤ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے۔ ذیل میں اس عہد کے شعراء و ادباء کے حالات مع نمونۂ کلام ہدیۂ قارئین ہیں۔

افضل خواجہ محمد افضل کا سن ولادت ۱۸۷۵ء بمقام ڈھاکہ ہے۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم ڈھاکہ میں حاصل کی۔

شاعرانہ مزاج اور علمی رجحان فطری تھا۔ ڈھاکہ میں اس زمانے میں اور کئی کہنہ مشق و قادر الکلام شعراء موجود تھے لیکن وہ سید محمد آزاد کے کلام کے ایسے گرویدہ تھے کہ انھیں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم عروض و زبان دانی پر کافی مہارت تھی۔ غزل بھی کہتے تھے اور نظم بھی لیکن صنفِ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بات بات پر قطعۂ تاریخ موزوں کر ڈالتے غالباً یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر انکے کلام میں قطعاتِ تاریخ کی زیادہ تعداد ہے۔ مجموعۂ تواریخ تین ضخیم جلدوں میں موجود ہیں۔ مرزا نواب خاں داغ دہلوی کی وفاتِ حسرت آیات پر ۱۱ تاریخیں اور نواب سر احسن اللہ خاں مرحوم کے انتقالِ پر ملال پر ۱۳ قطعات کہے۔ ایک تصنیف "غم ماہِ پیکر" ان کے کمالِ تاریخ گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ ان قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ ہے جو نواب بیگم سر احسن اللہ خاں کی رحلت سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے۔ اس کی یہ خصوصیت بھی قابلِ تعریف ہے کہ یہ سب قطعات صرف

ایک ہفتے کے اندر لکھے گئے تھے۔ جو ان کی مشق، مہارت اور قادر الکلامی پر دال ہے۔ تاریخ گوئی کی وجہ سے "افضل المورخین" اور "ناسخ ثانی" کے القاب سے مشہور رہیں۔

اپنے استاد کی طرح فارسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ فارسی کلام کا ایک دیوان ان کی فارسی دانی کا شاہد ہے۔ اردو میں کم گوئی کے باوجود بھی اتنا کہا کہ ایک دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔

کلام میں تاثیر بھی ہے زور بھی۔ بطور نمونہ اردو غزلوں میں سے چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ؎

سوال ایک بوسۂ لب کا جو ہم کرتے ہیں رو رو کر
وہ ہنس ہنس کر یہ کہتے ہیں یہ کہنا ہم نہ مانیں گے

صبحدم ماہ جبیں گھر کو چلا ماہ کے ساتھ
دامنِ صبح ہوا چاک سحر گاہ کے ساتھ

پاس ضد کا ہے تمہیں ورنہ مرا پرنالہ
لئے آغوش میں تاثیر کو ہے آہ کے ساتھ

ماہ غشب جو مرے ماہ جبیں کو دیکھے
بیخودی میں کوئی جھانکا کرے سو چاہ کے ساتھ

تارے گن وائیگی شب بھر تری افشاں مجھ کو
تنکے چنوائیگا سوے کمر اے جاں مجھ کو

جوشِ سودا میں ہوا گھر مرا زنداں مجھ کو
طوقِ ہنسلی ہے سلاسل رگ شریاں مجھ کو

دردِ دنداں کے تصور میں جو میں روتا ہوں

گوہر آسودہ نظر آتا ہے درماں مجھ کو

انسخ نام چودھری عظمت اللہ تخلص انسخ۔ تلمیذ نساخ۔ پنڈوا کے رہنے والے تھے اور وہاں کے خوشحال زمیندار تھے۔ تعلیم و تربیت کے مرحلے وہیں کلکتہ میں طے کئے اور عمر کا زیادہ حصہ وہیں گذرا۔ شعر و شاعری ان کا دلچسپ مشغلہ تھی۔ خود شاعر تھے اور شاعروں کی دل سے قدر کیا کرتے اس لئے شعر و شاعری کی مجلسیں ان کے ہاں جمی رہتیں۔ چنانچہ سلہٹ کے خواجہ جمیوز کے عزیز اور کلکتہ کے شاکر وغیرہ جیسے ارباب ذوق ان کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہوئے۔

شمس نام ابوالقاسم محمد۔ تاریخی نام "مظہر الحق"۔ یہ تاریخی نام حسب ذیل قطعۂ تاریخ سے نکلتا ہے جو ان کے والد بزرگوار عبدالغفور خان بہادر نساخ کی فکر کا نتیجہ ہے ؎

زاد فرزندم و زدیدارش — شد دلم شاد و چشم من روشن
نام تاریخیش کہ می جستم — مظہر الحق بگفت عقل بہ من

۱۲۸۴ھ

شمس بنگال کے ایک جلیل القدر شاعر اور مستند استاد تھے۔ نساخ کے صاحبزادے تھے۔ ظاہر ہے کہ گہوارۂ شعر و ادب میں پرورش پائی۔ سن ولادت ۱۸۶۷ء بمقام فرید پور (مشرقی بنگال) ہے۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں کامل قدرت تھی۔ شاعری کی طرف ایام طفولیت سے مائل تھے۔ باپ کی کڑی نگرانی اور تعلیمی پابندیوں کے باعث بیٹے کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ کبھی اپنے شاعر باپ کے سامنے اپنے ذوق شعر گوئی کا راز ظاہر کرتا۔ لہٰذا شروع شروع میں اپنے والد سے نگاہ بچا بچا کر ان کے

شاگرد راسخ سے اصلاح سخن لیا کرتے۔ جب ذہنی شعور بیدار ہوا تو داغ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اب یہ وہ وقت تھا کہ نساخ کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شمس کو لائق باپ کی لائق اولاد ہونے میں کوئی کلام نہیں رہا۔ شمس اپنے والد کے بجائے داغ کے کلام سے بیحد متاثر ہوئے اور اسی لئے ان کے کلام میں داغ کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ جرأت کے رنگ میں بھی اکثر اشعار کہے۔ چست بندشیں، مضمون میں گھلاوٹ، زبان میں حلاوت و شیرینی۔ کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ داغ دہلوی نے اپنے ایک مکتوب میں شمس کے کلام کی یوں توصیف کی ہے

"تم اچھے تمھاری بات اچھی، تمھاری زبان اچھی"

ایک کامیاب شاعر کی زبان دانی کی اس سے بہتر جامع و مانع سند کہیں نہیں مل سکتی۔

ایک دفعہ شمس نے ایک غزل داغ کے پاس بغرض اصلاح بھیجی تو داغ نے بڑی تعریف کی اور یہ لکھ کر من وعن واپس کر دی ——"داغ اس سے بہتر نہیں کہہ سکتا" اس غزل کا مطلع ہے ؎

خفتگانِ خاک سے ہیں سلسلے ٹوٹے ہوئے
قافلے والوں سے ہیں بچھڑے ہوئے چھوٹے ہوئے

داغ عظیم آباد اور کلکتہ اکثر جایا کرتے تھے عظیم آباد میں ایک غزل کہی تھی جو بہت مشہور ہے ؎

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اس زمین میں امیر لکھنوی نے بھی غزل کہی تھی ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مطلع ہے

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

شمس نے استاد کی زمین میں غزل کہی۔ مقطع ہے ؎

اگر اللہ نے چاہا تو اس کافر کو شمس اک دن

مسلماں کر کے اٹھیں گے۔ برہمن بن کے بیٹھے ہیں

داغ نے اس شعر کو سُنکر کہا تھا کہ میں اس سے بہتر نہیں کہہ سکتا[1]"

رضا علی وحشت کا ارشاد ہے "یہ میرے استاد کا بہترین شعر ہے"

معشوق کے حسن کا عالم بیان کرنا شاعر کی قدرت سے باہر ہے وہ

حیران ہو کے رہ جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

شکل وہ شکل کہ تصویر کو بھی سکتہ ہو

حُسن وہ حُسن کہ رہ جایئے حیراں ہو کر

جستجو لطف سے خالی نہیں ہے اگرچہ حصول مقصد محال ہے۔ یہ مضمون

یوں ادا کیا گیا ہے ؎

مزے کی زیست ہے امیدوارانِ محبت کی

بہت اچھے ہیں وہ جو سعیٔ لاحاصل میں رہتے ہیں

غالب نے کہا ہے ؎

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پہ نہ ہوا تھا

---

[1] مقالات وحشت

شمسؔ اس سے پہلے اپنے لئے ایک تسلی کی صورت نکالتے ہیں ؎

نالاں ان سے ایک جہاں ایک ہمیں نہیں
کافی ہے یہ خیال تسلی کے واسطے

غالبؔ نے کہا تھا۔

کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

شمسؔ نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا ؎

میں جس کو پی رہا ہوں وہ حاضر ہے واعظو
تم جس کو کہہ رہے ہو وہ کیسی شراب ہے؟

شمسؔ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت کی ان کے ہمعصروں میں مرشد آباد کے نواب نصیر الملک عارفؔ اور عبدالحلیم عصیمؔ یہ دو نامور شعرار تھے۔ اول الذکر خوش فکر شاعر تھے اور شعر و ادب کے بہت بڑے محسن و سرپرست آخرالذکر 'نالۂ عصیم' اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ اپنے زمانے کے بہترین صحافیوں میں سے تھے۔ زمانہ کا نپور بہت عرصہ تک ان کی ادارت میں ہفت روزہ کی صورت میں نکلتا رہا۔ ان کے بعد پنڈت دیا نرائن نگم نے اس کی کرسئی ادارت سنبھالی۔

شمسؔ کے تلامذہ میں وحشتؔ، صولتؔ اور اکملؔ جیسے نکتہ سنج وار باز ذوق آسمانِ ادب کے آفتابِ عالمتاب بن کر چمکے جن کا تذکرہ چوتھے دور کے باب میں شامل کیا جائے گا۔

صرقؔ میر حسین مرزا المتخلص بہ صرقؔ رئیس ڈھاکہ میر اشرف علی کے نواسے تھے۔ میر امیر علی آشنا مرشد آبادی اور غلام حیدر حجیبؔ سے کسب فیض کیا۔ ۱۸۷۱ء میں جب نساخؔ کا "تذکرہ محسن الشعراء" زیر تصنیف تھا۔ اس وقت یہ جوان تھے۔ سخن الشعراء میں بھی ان کا حال ملتا ہے ــــ

طبیعت اچھی پائی تھی۔ کلام سے شاعرانہ عظمت نمایاں ہے ؎

بخدا ترکِ آرزو کے سوا
دل میں گر کوئی آرزو بھی ہو

تمھیں صورت کا غرہ ہے تو یاں دل کی محبت ہے
تمھارا حسن مہنگا ہے تو کس کی جان سستی ہے

ایک بندہ کی بھی جاں بخشی نہ کی
اے بتو تم سے خدائی ہو چکی

حسرت

نام منشی دلیل الدین احمد۔ تخلص حسرت۔ ان کے والد مولوی محمد فیض بخش کا وطن ڈھاکہ (جہانگیر نگر) تھا۔

حسرت ۱۸۲۶ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ شروع میں ناسخ سے اکتساب فن کیا پھر ان کے بیٹے شمس سے باقاعدہ اصلاح لی۔ اپنے استاد (شمس) کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھیں کے رنگ میں بیشتر اشعار کہے۔

بنگال کے علاوہ انھیں متحدہ ہندوستان کے مشہور مقامات اور حیدرآباد دکن، مدراس، دہلی، وغیرہ جیسے بڑے بڑے شہروں کی سیر و سیاحت کا خوب موقع ملا۔ اور اپنے عہد کے مشاہیر ادب و اکابر سخن کی صحبتوں سے مستفید و فیضیاب ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو اور ہندوستانی کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

کہیں تھے بادیہ پیما کہیں تھے سلسلہ جنباں
جہاں پہنچے ہمارے پاؤں میں چکر ہی چکر تھا

تری رنگیں اداؤں کا وہ عالمگیر نقشہ ہے
کہ ہر ذرے سے کثرت کے عیاں ہے نور وحدت کا

بے نیازی کا ہے دعویٰ بیکار — ایک کا ایک ہے انساں محتاج

چشمِ بلبل میں انتظار ہوں میں — آمدِ موسمِ بہار ہوں میں

کیوں میں نکلوں تمھاری محفل سے — دلِ دشمن کا کیا بخار ہوں میں

جوہر — نام منشی محمد سیف اللہ خاں۔ تخلص جوہر۔ وطن و مسکن اسلام آباد منشی امیر اللہ تسلیم جو اپنے زمانے کے خوش فکر شاعر اور جید عالم تھے کی ذاتِ گرامی سے بطور خاص استفادہ کیا۔ نمونہ کلام ؎

رکتا نہیں ہے پاؤں زمیں پر غرور سے
اس رشکِ حور کا ہے دماغ آسمان پر

خوش نگاہوں کا نگاہوں میں سمانا ہے غضب
دیکھتے دیکھتے دل صاف چرا لیتے ہیں

ہاں سن کے مضطرب کہیں وہ فتنہ گر نہ ہو
فریاد بھی وہ کیجئے جس میں اثر نہ ہو

قتل کرنے کے لئے کیا کم ہے یہ ترچھی نظر
رکھ دے قاتل خنجرِ فولاد اپنے ہاتھ سے

شاہین — نواب احسن اللہ شاہین کے آبا و اجداد نے کشمیر سے آکر ڈھاکہ میں رہائش اختیار کر لی تھی جو قالین اور شال وغیرہ کے بہت مالدار تاجر تھے۔ شاہین کے والد خواجہ نواب عبدالغنی لاکھوں روپوں کے مالک تھے۔ انھوں نے شاہین کی تعلیم کا خاص بندوبست کیا۔ انگریزی زبان کی تعلیم کے لیئے ایک انگلستانی اتالیق کا ایک ہزار روپیہ ماہوار پر تقرر کیا۔ عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے مختلف مقامات سے جید عالم و فاضل اساتذہ کو بڑی بڑی تنخواہوں

پر مقرر کیا - اردو زبان اُن کے گھر کی زبان تھی اور گھر کا ماحول قطعیٔ شاعرانہ تھا ۔ شاہین نہایت علم دوست اور عالموں کے دل سے قدردان تھے - چنانچہ دور دراز سے اہلِ کمال ان کے یہاں ٹھہرتے تھے اور ان کے چشمۂ علم و دولت سے فیضیاب ہوتے تھے - شاہین اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور ہندی میں بھی گو ہندی کلام کی تعداد بہت کم ہے - ٹھمری ، دادرے اور گیت وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی - کئی تصانیف ان کی یادگار رہے ہیں جو غیر مطبوعہ ہے -
انتقال دسمبر ۱۹۰۱ء میں ہوا ۔

کہا زخمِ جگر کو دیکھ کر میرے مسیحا نے
نہیں کچھ جان ہے اس میں فقط دم شماری ہے

جو پوچھا اُس سے میں نے کیوں بھلا یہ شرطِ الفت ہے
تو بولا کیا کریں ہنس کر یہی عادت ہماری ہے

ڈراتا کیا ہے مجھ کو ناصحا تو خوفِ محشر سے
اُسے جا کر نصیحت کر جسے یہ جان پیاری ہے

قربان قمر ہے ترے عارض کی ضیاء پر
خورشید فدا جدّتِ سیمیں کی ضیاء پر

رکھتی ہے لگا منہ ترے رخسار سے ہر دم
رشک آئے مجھے کیوں نہ تری زلفِ دوتا پر

شاہین اپنے ماموں عبدالغفار آختر کی شاعرانہ عظمت کے معتقد تھے اور انھیں کو اپنا کلام دکھالیا کرتے تھے -

آشنا

نام عبدالکریم - تخلص آشنا - کلکتہ کے رہنے والے تھے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے ۔

ضبطِ نالاں باعثِ چاکِ گریباں ہوگیا
کام یوں دستِ جنوں کا اپنے آساں ہوگیا

حمید

حاجی حافظ مولوی عبدالحمید حمید کلکتہ کے نہایت قابل قدر شاعر، مجموعۂ کمالات مجتمع الصفات بزرگ اور بنگال کے دلدادگانِ سخن کے لئے ایک عزیز القدر نعمت تھے۔

حمید، ناسخ کے تلامذہ ارشد میں سے تھے۔ کچھ دنوں آتش کو بھی بغرض اصلاح اپنی غزلیں دکھائیں طبیعت میں بلاکی روانی اور رموز و نیت پائی تھی۔ سخن سنجی پر قادر تھے۔ زبان پر اچھی نظر اور فنِ عروض پر اچھی مہارت تھی۔ ان کی بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے چلتے بات بات پر حسب حال و موقع اشعار کہا کرتے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

درد سے چارہ دردِ دلِ شیدا ہوگا
جوشِ حرماں سببِ ترکِ تمنا ہوگا

پاس میرے بھی کبھی آئیے گا
تا بکے دور سے ترسائیے گا

ہوگیا ہے عشق دل کو اس بتِ طناز کا
یاالٰہی ہو بخیر انجام اس آغاز کا

حیدر

نام مصطفےٰ حیدر اور تخلص حیدر۔ ان کے والد مولوی غلام حیدر۔ مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور سررشتۂ فورٹ ولیم کالج تھے۔ حیدر کا مولد و وطن چاٹگام اور مسکن کلکتہ تھا۔ تعلیم و تربیت ان کے والد کے زیر نگرانی ہوئی۔ جب شاعری کا شوق دامنگیر ہوا تو ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل لے کے مرا صاف مکر جاتے ہیں
جب مانگو تو جھنجلا کے یہ کہتے ہیں کیا؟

ادھر تو دیکھو نہ بولو ذرا سنو تو سہی
شب وصال میں کیسی حیا سنیو تو سہی

بس قتلِ عاشقاں پہ نہ بیڑا اٹھائیے
لاکھوں کا خون ہو گا نہ لاکھا جمائیے

حمید قاضی حمید الدین حمید ۔ علی پور نواح کلکتہ کے باشندے تھے ۔ مزید حالات دستیاب نہ ہو سکے ۔ ایک غزل کے تین اشعار مندرجۂ ذیل ہیں ؎

غمزہ یہ کہہ رہا ہے کسی کی نگاہ سے
بچ کر نہ جانے پائے کوئی جلوہ گاہ سے

آنکھوں میں ہے خمار پریشاں ہیں میرے سر
نکلا ہے کس ادا سے کوئی خواب گاہ سے

پیرِ مغاں کے وصف سنائیں گے بادہ خوار
کیا پوچھتے ہو زاہدِ گم کردہ راہ سے

حیدر منشی حیدر علی ۔ حیدر ۔ خلف منشی غلام نبی باشندگان ہوگلی میں سے تھے ۔ نہایت خوش مزاج اور ظریف طبع شخص تھے ۔ مزاحیہ کلام کہتے تھے اور خوب کہتے تھے ۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

حال دل گر کہوں تو کہتا ہے
شوق مجھ کو نہیں کہانی کا

شاکر منشی عبد السبحان شاکرؔ قاضی اکبر علی کے صاحبزادے کلکتہ کے رہنے والے ، اور مولوی عظمت اللہ انسخ تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

تڑپتے ہیں ترے کوچے میں قاتل نیمجاں کیا کیا
تماشے مرغِ بسمل کے دکھاتے ہیں جواں کیا کیا

قطعہ

کاہید گئی جسم کا ممنون کیوں نہ ہوں
پہونچا ہے کوئے یار میں بادِ صبا کے ساتھ
دو دن میں حال آپ کا کچھ اور ہو گیا
کیا خوب ہم سے پیش تم آئے وفا کے ساتھ

شوکت منشی محمد اسمٰعیل خاں نام ۔ شوکت تخلص ۔ ساکن کلکتہ انسخ کے لائق شاگردوں میں سے تھے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گلہ کس سے کروں دردِ جگر کا
ہوا ہے ناک میں دم چارہ گر کا
پھر بہار آئی ہوا پھر جوشِ سودا کا فزوں
دوڑتا ہے ہاتھ پھر اپنا گریباں کی طرف

عزیز عبد العزیز المتخلص بہ عزیز منشی کرامت اللہ رئیس کلکتہ کے خلفِ اکبر تھے ۔ اوائل عمر سے شعر کہتے تھے اصلاح کلام آنسخ سے لیتے تھے ۔ اکثر و بیشتر اشعار رنگِ قدیم میں پائے جاتے ہیں ۔ مگر صاف، شگفتہ اور بعض بلند ہیں خیالات کی جامع بندش و مضمون آفرینی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ اس قدر پُر گو اور زود گو تھے کہ عنفوانِ شباب ہی میں ایک ضخیم دیوان

مرتب ہوگیا جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ کلام میں رعنائی و دلکشی کا فقدان ہے ان کے دیوان سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

ذرہ افشاں یہ نہیں ہے زلفِ عنبر خام میں
تارے جھلکے ہیں مقرر یہ سوادِ شام میں

کرتے ہیں یوں مریضِ محبت کا وہ علاج
دیتے ہیں زہر گھول کے مجھ کو دوا کے ساتھ

خواب میں ہمکنار دلربا تھا مجھ کو ہے ہے جگا دیا کس نے

آج خنجر بُرّاں سے جدا ہوتا ہے
مجھ پہ قاتل کا جو احساں تھا ادا ہوتا ہے

نادرؔ سید نجم الدین حسین ولد سید قمر الدین متوطن ہیمن سنگھ مقیم ٹالی گنج نواحِ کلکتہ علم طب و رمل میں ماہر تھے۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

ضبط کر رکھتا ہوں آہوں کو دلِ غمناک میں
ورنہ اس چرخ ستمگر کو ملا دوں خاک میں

جو نیند آگئی تم کو تو ہاں سمجھ لونگا "نہیں نہیں" یہ تمہاری مجھے پسند نہیں

ناجیؔ میرزا زیر علی ابن میر حسن علی آغازِ شاعری میں آغا حجو شرف لکھنوی مقیم مٹیا برج کلکتہ سے استفادہ کیا۔ بعدہٗ سید محمود آزاد ساکن ڈھاکہ سے مشورۂ سخن کیا۔ ۱۳۲۷ھ میں ۶۰ سال کی عمر میں رحلت کی۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

نشۂ حسن میں ہو چور رکھو ہوش میں پاؤں
شیشۂ دل کے ہیں ٹکڑے حذفِ راہ کے ساتھ

سنتے ہی غیر غیر کا حال آئے دوڑے وہ　　　　آنکھیں پُر آب زلف پریشاں کئے ہوئے

بیدار نام خواجہ محمد بیدار بخت، تخلص بیدار۔ ان کے والد ماجد کے نام خواجہ محمد اکبر نقشبندی تھا۔ سنِ ولادت، ۲ مارچ ۱۸۸۲ء بمقام ڈھاکہ ہے انگریزی۔ فارسی۔ عربی و اردو میں استعداد کامل تھی۔ بیدار نے ۱۱ سال کی عمر میں جو پہلی غزل کہی اس کا مطلع سُنئے ؂

جو اس بت پر آئی تو کیا ہے کسی کا　　　　طبیعت پہ بھی بس چلا ہے کسی کا

سرزمین بنگال میں جن شعراء کو مرزا نواب خاں داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا ان میں شمس کی طرح بیدار کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ داغ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے داغ کے مکاتیب خصوصاً وہ جو غزلوں کی اصلاح کے سلسلہ میں بھیجے تھے اردو ادب میں گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بیدار کلام داغ سے بیحد متاثر تھے۔ اور ان کا کلام خصوصیت کے ساتھ مزے لے لیکر پڑھا کرتے ہر شعر کے فن و معنوی پہلوؤں پر غور و فکر کرتے اور ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار بھی خصوصیاتِ داغ سے مملو ہیں۔ دہلی کی زبان و محاورے ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے ایک قابلِ قدر مقالہ[۱] میں تحریر فرماتے ہیں۔

"بیدار مرحوم کے کلام کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جو غزلیں وہ استاد کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجا کرتے تھے اُن میں بہت کم اصلاح کی گنجائش ہوتی تھی چنانچہ ان چار غزلوں میں سے ایک غزل کے

---

[۱] "مشرقی پاکستان کے اردو ادیب"

متعلق استاد (داغ) نے لکھا ہے — "آپ نے غزل خوب کہی۔ مجھے بہت پسند آئی" اور پانچ شعروں پر صاد بنا دیا ہے جو خصوصیت کے ساتھ پسندیدگی کی علامت ہے۔ ان میں سے دو شعر سنیئے ؎

ہمارے گھر بھی وہ آئے گئے غیروں کے بھی گھر میں
مگر تھا فرق یہ بیٹھے کہیں دم بھر کہیں برسوں

بجا ہے تم تو وعدے کے بڑے سچے ہو کیا کہنا
ہمیں جھوٹے ہیں یا دم دیتے رہے تم کو ہمیں برسوں

اس شعر میں استاد کا رنگ کس درجہ نمایاں ہے۔ یہ مقطع سنیئے ؎

نہیں پہچانتے تم کون وہ محفل میں بیٹھا ہے
وہی بیدار ہے جو رہ چکا ہے دل نشیں برسوں

ایک اور غزل کے متعلق استاد نے فرمایا ہے — "خواجہ صاحب آفریں ہے کیا غزل کہی ہے" اس کے چند شعر سنیئے :؎

چار دن بھی نہ رکھا چرخ نے شاداں مجھکو
دیدیا درد و غم و رنج فراواں مجھکو

طور بے طور ہیں وہ دن میں وہ کھل کھیلیں گے
اب نظر آتے ہیں کچھ اور ہی ساماں مجھکو

شکوۂ جور پہ محشر میں یہ اُن کا کہنا
مجمع عام میں کیجے نہ پشیماں مجھکو

بت پرستی میں تو بیدار کٹی ساری عمر
لوگ کیا دیکھ کے کہتے ہیں مسلماں مجھکو

بیدار کا ایک مقطع تھا ؎

وہ عاشقِ جانباز وہ شیدائی تمھارا
بیدار جو تھا مر گیا کچھ تم نے سنا بھی

اس مقطع کے متعلق استاد کا ریمارک اور اصلاح نہایت دلچسپ ہے فرماتے ہیں ؎

"ایسا منحوس مقطع سننا گوارا نہیں کرتا۔ اس وجہ سے ناگوار ہوا۔ اور اُس کو بدل دیا"

اُستاد کی اصلاح کے بعد مقطع کی یہ صورت ہوگئی ؎

وہ عاشقِ دلدادہ وہ جانباز تمھارا
بیدار کسی اور سے اٹکا ہے سُنا بھی

واقعہ یہ ہے کہ اس اصلاح کے بعد مقطع بہت خوب ہو گیا اور استاد کا خاص رنگ بھی اس میں پیدا ہو گیا جو انھیں کا حصہ ہے۔

بیدار کا یہ مقطع بھی خوب ہے ؎

کٹی آنکھوں میں شبِ غم نہ برآئی اُمید
میں ہوں بیدار مگر بخت تو بیدار نہیں

اعظم خان بہادر خواجہ محمد اعظم خواجہ عتیق اللہ شیدا کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اردو شعر و ادب کا مذاق ورثے میں ملا ہے۔ نثر سے خاصی دلچسپی ہے۔ ان کا ناول "بری بہو" جو در اصل بنگلہ زبان سے ترجمہ ہے قابل ستائش ہے۔

احسن مشرقی بنگال میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن المتخلص بہ احسن کی خدمات قابل قدر ہیں اپنے زمانے کے بلند پایۂ انشا پرداز اور باکمال شاعر تھے۔ حکیم صاحب کے آباؤ اجداد پشاور کے رہنے والے تھے

ان کے والد ماجد پشاور سے دیوبند آگئے اور وہیں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا اشرف علی تھانوی ان کے ہم سبق تھے۔ اس کے بعد ڈھاکہ میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

بنگال کے عربی داں لوگوں میں علم طب کے فروغ دینے اور غربا کی طبی امداد کی غرض سے ڈھاکہ میں ۱۹۳۲ء میں "طبیہ حبیبیہ کالج" کی بنیاد ڈالی یہ کالج آجتک قائم ہے گو پہلے کی نسبت زیادہ ترقی پذیر نہیں۔

حکیم حبیب الرحمٰن کی ولادت ۱۸۸۱ء اور وفات ۱۹۴۷ء بمقام ڈھاکہ ہوئی۔ ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان کا سب سے پہلا اخبار "المشرق" ۱۹۰۶ء میں انھیں کی ادارت میں نکلا تھا۔ "الفاروق"۔ "حیات سقراط" کے علاوہ ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ جادو ڈھاکہ جاری کیا۔ ان کی تصانیف میں "ثلاثۂ غبار"۔ "آسودگانِ ڈھاکہ"۔ "ساجدِ ڈھاکہ"۔ "ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے"۔ "کچھ اپنی باتیں"۔ "ڈھاکہ کی تاریخی عمارتیں" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بچپن سے شعر کہتے تھے۔ لکھنؤ، دہلی، آگرہ اور کانپور کی خوب خوب سیر کی اور وہیں دینیات وطب کے درس سے سبکدوش ہوئے بڑے بڑے مشاعروں میں بھی برابر شرکت کی۔ مرحوم شعر بہت کم کہتے تھے۔

زاہدِ خستہ بتانے کے نہیں ہم سجھ کو
کعبہ یاد بہ غرض ہم نے کہیں دیکھ لیا
جھک پڑا سجدۂ بت کے لئے توبہ توبہ
ہم نے احسن ترا ایمان ترا دین دیکھ لیا

خالد — محمد عبدالرب صدیقی جو ادبی دنیا میں خالد بنگالی کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع میمن سنگھ (مشرقی بنگال) کے بولائی نامی

ایک گاؤں کے رہنے والے تھے مولانا عبدالحی آختر جو تقریباً پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے، خالد کے والد ماجد تھے۔ خالد بنگالی کا شمار بیسویں صدی کے اوّلیں دور کے مایہ ناز وجلیل القدر انشاء پرداز اور ممتاز و باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ آج سے تقریباً پچیس تیس سال قبل خالد کے علمی مضامین اور نظمیں بنگال اور بیرون بنگال کے رسائل وجرائد مثلاً نقاد آگرہ، حرم پیلی بھیت (یو۔پی) عالمگیر لاہور۔ جدیدہ اردو کلکتہ وغیرہ میں برابر شائع ہوا کرتے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں خالد بنگالی نے بولائی جیسے مقام سے ماہنامہ اختر جیسا کامیاب اور معیاری صحیفہ جاری کر کے اردو زبان سے والہانہ محبت اور ادب کی بے لوث خدمت کا جو ثبوت دیا۔ اس کی مثال اردو کی تاریخ میں خال خال ہے اس پرچہ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس کے اوراق ملک کے مشاہیر اہل قلم وحشت کلکتوی، ناطق لکھنوی۔ آرزو لکھنوی۔ نیاز فتحپوری۔ دلگیر الہ آبادی۔ مائل الہ آبادی وغیرہ کے رشحات لطیف وجمیل سے مزین ہوتے۔

خالد نے اختر کے سب سے پہلے شمارے میں جو اداریہ لکھا اس کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجئے کہ بنگال کے ایک گمنام دورافتادہ چھوٹے سے دیہات میں بھی اردو زبان سے کس قدر دلچسپی تھی صرف یہی نہیں بلکہ یہ مضمون اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

"اختر ایک اردو رسالہ ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس کی اشاعت ایک ایسے مقام سے ہو رہی ہے جہاں اس رسالہ کی زبان (یعنی اردو) بعض بعض حلقوں میں صرف سمجھی جاتی ہے۔ اردو سے اس قدر بیگانہ

دشی دیکھتے ہوئے بھی مجھے خوب معلوم ہے کہ بنگال کے اکثر مسلمان گھرانے جن کی مادری زبان آج بنگالی ہے ان لوگوں کی نسلیں ہیں جو عربی، فارسی یا اردو کے بولنے والے تھے۔ واقعات تاریخی ایک طرف اس امر کی بین شہادت خود ان گھرانوں کی زبان ہے جس میں مذکورہ زبانوں کے ہو بہو اور بعض کی قدر تبدیل مخارج کے ساتھ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں اشاعتِ اردو کی دشواری کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اردو وہ زبان ہے جس کی ہمہ گیری اور مقبولیت آج تاریخ السنۂ عالم کا زرین واقعہ اور نہایت درخشاں کارنامہ ہے۔ مشرقی بنگال میں جن لوگوں کو آج مذاقِ اردو سے بیگانۂ محض پاتا ہوں اور جن حالتوں میں اشاعتِ اردو کی سعی کرتے ہوئے ایک سے زائد اسباب کی بنا پر مجھے پس و پیش ہے یہ ان اسلاف کی یادگار ہے ان بزرگوں کی اولاد ہیں جن کی صحبتوں میں آ کر مصر، بغداد، اور اصفہان و شیراز کے سیاح بولئے انھیں پائے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے مرز بوم کی یاد فراموش کر بیٹھے تھے۔

مصنف نصیر الدین حیدر مرحوم مؤلف "سہیل یمن" جن کی غیر مطبوعہ مثنوی "بکاؤلی" اردو کے دورِ اوّل کی قابلِ رشک مثال کہی جا سکتی ہے۔ دونوں اسی بنگالہ کے رہنے والے تھے اور دونوں نے اس سرزمین میں رہ کر پرورش پائی تھی۔ جس کے ذرے آج آپ کی بد ذوقی اور جمودِ فطرت پر نالاں ہیں۔"

خالد کی نثر نگاری کے بہت سے نادر نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں مگر طوالتِ ضخامت کے خوف سے قاصر ہوں۔ خالد کے مکاتیب بھی اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو غالب اور سر سید احمد خاں

کے مکتوبات سے ہرگز کم نہیں۔

خالد بنگالی نہ صرف بنگلہ بلکہ فارسی اردو، عربی زبانوں پر بھی حاوی تھے اور ہر زبان کی جملہ اصناف پر اہل زبان جیسی قدرت رکھتے تھے ان کی تالیفات و تصنیفات میں "واقعاتِ پدر و پسر" قابلِ ذکر۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ان کا کلام ہر رنگ و ہر خوبی سے مملو ہے غزلوں اور نظموں کی تعداد بے شمار ہیں۔ میرے پاس ان کی کئی غیر مطبوعہ نظمیں موجود ہیں جو تقسیم ملک سے پہلے کلکتہ میں ابوالمکارم سلیم اللہ فہمیؔ سے توسط سے دستیاب ہوئی تھیں جی چاہتا ہے کہ سب کی سب نقل کر ڈالوں مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ضخامت میں ناگوار حد تک اضافہ ہو جائیگا۔ پھر نظم جب تک پوری کی پوری نقل نہ کی جائے لطف نہیں آتا۔ بقول سلیم اللہ فہمیؔ "زبان پر بے پناہ قدرت، محاورات اور روزمرہ کے استعمال میں یدطولیٰ۔ ان خوبیوں نے ان کے کلام کو بڑا معقول بنا دیا ہے۔ مضبوط اور ریختہ زبان میں تصوف اور فلسفہ کی چیزیں اپنا ملبند مقام رکھتی ہیں۔ غزلوں میں محبت کی چاشنی کا رنگ خاص ہے۔ جذبات انداز بیان، ترنم اور زبان کا لطف ان کے کلام کو بہت ممتاز بنا دیتا ہے۔"

بطور نمونہ از خروارے ایک نعت پیش کرتا ہوں جو اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث خالد کو حیات جاودانی بخشتی ہے اُردو ادب میں نعت کی ایسی نادر مثال شاذو نادر ہی ملتی ہے ؂

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ

خسرو سرمد، تخت نہ مسند، فخراب وجد، یعنی محمدؐ

نورِ مجید، روحِ معنبر، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ

گوہرِ وحدت، آیۂ رحمت، کانِ نبوت، بحرِ نبوت
عاشقِ امّت، شافعِ محشر، صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

جانِ دو عالم، حق کے مکرم، اپنے رب کی شانِ معظم
لطفِ مجسم، خاصۂ داور، صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

یادِ نبی ہے یمن سے مملو، روزِ شفاعت، ثقلِ ترازو
جسم کی خوشبو عطر سے بڑھ کر صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

نور سے جس کے طور ہوں سینے، بغض ہو دل میں اور نہ کینے
جاؤ مدینے گر نہیں باور، صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

مجدِ شمائل، وصف میں کامل، اقصیٰ جن کی پہلی منزل
سیّدِ عادل، فقر کے باور صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

نیرِ بطحیٰ، انجمِ طٰہٰ، ماہِ دنیٰ اور مہرِ تدلّٰی
زینتِ کعبہ رونقِ ممبر صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

امنِ ایماں، ملجا، عرفاں، سایۂ یزداں، رکنِ عزیزاں
حسن کے ارماں، عشق کے دل جو، صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

ہیبتِ حقہ، نکبتِ باطل، شوکتِ عظمیٰ قدرتِ کامل
حکمتِ فاضل، حرکتِ رہبر صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

جلوۂ عارض شکلِ احد میں، صبحِ ازل میں، نورِ صمد میں
شامِ ابد میں، ظلمتِ گیسو صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

جاہِ سکندر، حشمتِ کسریٰ۔ گردِ سواری اللہ اللہ
عرش پہ تکیہ فرش پہ قابو، صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم

حسن سے روشن کعبۂ یزداں، رشک سے گلشن معبد گبراں
لطف سے شاداں جبریل امیں صلّی اللہ علیہ وسلّم

ہونٹوں پہ شیدا حسنِ تکلم، کیف کی جنت، وجہ تبسم
جزو نغم، آبروئے دیں صلّی اللہ علیہ وسلّم

ایک غزل کے چند اشعار بھی سن لیجئے ۔

نئی منطق اب ہوئی رہ نما، وہ پرانی طرزِ سخن گئی
یہ سرودِ بربطِ نو سنو کہ نوائے سازِ کہن گئی
غمِ عمرِ خضر جنھیں رہا یہ بتائیں دہر سے کیا ملا
نہ نصیب غایتِ خرمی نہ وہ فکرِ گور و کفن گئی
مجھے خالدؔ اب نہیں اس کا غم نہیں مجھ پہ وہ نگہ کرم
ہیں دل اپنا ان سے طلب کروں کہیں جان پر جو نہ بن گئی

ان کے شاگردوں میں محمود بنگالی، اخضر لولائی اور حبیب بنگالی پُرگو اور ممتاز شاعر ہیں۔

عبد الکریم مولانا عبد الکریم سلہٹی بی۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی بنگال کی ان معدودے چند قابل قدر ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی و اردو زبان کی تعلیم و ترقی کی غرض سے دامے، درمے، قلمے، سخنے بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر عبد الرحیم ایم۔ اے (علیگ۔ ڈھاکہ) کے بڑے بھائی تھے۔ عبد الکریم شاعر نہ تھے۔ مگر اس کے سوا کچھ تھے، نامور سیاست داں، قوم و ملک کے سچے بہی خواہ و ہمدرد، اردو، فارسی، عربی و انگریزی ادب کے ماہر، مشہور قاضی اور بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔

۱۸۸۵ء میں بی۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد کلکتہ سے ایک روزانہ

اخبار" دار السلطنت" نکالا۔ اُس زمانے میں یہ اخبار کلکتہ کا واحد مقبول عام و خاص اخبار تھا۔ مضامین کا حصہ اس اعتبار سے کافی بلند اور اچھوتا ہوتا تھا کہ اس کے مضامین انگریزی پر لکھے جاتے تھے۔ اس کا یہ کارنامہ بھی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے بنگال میں لارڈ امن کے عہد میں اردو زبان کی حمایت میں سب سے پہلے ورناکیولر پریس ایکٹ VERNACULAR - PRESS ACT - جاری کرایا تھا۔

ان کی متعدد علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی اور سیاسی تصانیف کی صراحت حسب ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ ہند — اردو اور انگریزی میں - HISTORY OF INDIA FOR BEGINNERS - ہسٹری آف انڈیا فار بگنیرز، کے نام سے شائع ہوئی۔ بنگال اور بہار کے علاوہ حیدرآباد دکن کے اسکولوں میں بھی منظور شدہ تھی۔ اخبارات وجرائد مثلاً زمانہ کانپور۔ الہلال - کلکتہ (جس کے ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد تھے) وغیرہ میں تحسین آمیز تبصرے شائع ہوئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ شمس العلماء سید امداد امام شاد عظیم آبادی۔ وغیرہ جیسے یگانۂ روزگار مورخ و اہل علم و عمل نے بھی اس کتاب کی بجد تعریف کی۔ مشاہیر کی آراء سے قطع نظر یہ امر اس کی انتہائی مقبولیت کا ثبوت ہے کہ سات بار اس کی اشاعتیں ہوئیں (سنہ ۱۸۹۶ء تا سنہ ۱۹۳۶ء)

(۲) "بھارت برشیر انیھائش — بنگالی اور ہندی زبان میں ۲۴ ایڈیشن شائع ہوئے۔

آخری ایڈیشن کا سنِ اشاعت سنہ ۱۹۳۰ء ہے۔ یہ کتاب بھی کلکتہ

اور بہار کی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

۳۔ اسلام اور عروج سائنس و تمدن۔

اس کے علاوہ متعدد کتابیں انگریزی زبان میں لکھیں جن کے ترجمے اردو اور بنگلہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رابیندر ناتھ ٹیگور جیسے شہرۂ آفاق فن کار نے آخر الذکر کتاب کی بہت تعریف کی تھی۔

عبدالکریم کے سوانح حیات اور کارنامے انگریزی زبان میں LIFE OF ABDUL KARIM. کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا کتابیں خاکسار مؤلف کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں جو ان کے بھائی پروفیسر عبدالرحیم صاحب کی عطیہ ہیں۔

علامہ آرزو لکھنوی
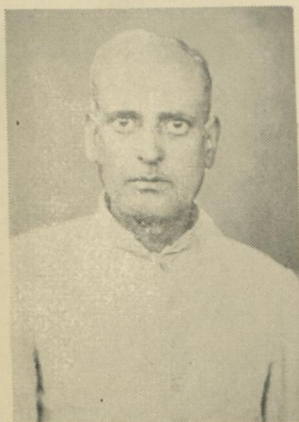
جرم محمد آبادی

محمود طرزی

عابد داناپوری

چوتھا دور

سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۵۴ء

آزاد، وحشت، ناطق و آرزو کا زمانہ

تمہید چوتھا دور، یعنی دورِ حاضرہ، کو ترقی و ارتقاء کے دور سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں اردو ادب جس ترقی و عروج کی منزل پر گامزن ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے اردو نظم و نثر میں گراں قدر و قابلِ رشک اضافہ ہوتا رہا ہے برصغیر ہند و پاک کے دیگر مقامات میں جہاں آثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی

نیاز فتحپوری - حسرت موہانی مرحوم، صفی لکھنوی مرحوم، نوح ناروی مرحوم - سیماب اکبر آبادی مرحوم، محوی صدیقی - بیخود دہلوی وغیرہ جیسے اساتذہ فن و سخن کا طوطی بول رہا ہے - وہاں مشرقی و مغربی بنگال میں ابوالکلام آزاد - رضا علی وحشت، ناطق لکھنوی مرحوم - آرزو لکھنوی مرحوم - شرف الحسین شرف - عندلیب شادانی - کیفی چڑیاکوٹی تمنا عمادی پھلواروی، آثر رودولوی وغیرہ جیسے یکتائے روزگار سخن سنج و مشاہیر ادب کی شمع تخلیقات سے محفلِ شعر و ادب جگمگا رہی ہے۔

زندگی کی جن قدروں کے تحت ملک کے دو ٹکڑے ہوئے ان کا اثر ہمارے ادب، زبان، کلچر، تمدن، ثقافت اور ہر شعبۂ حیات پر پڑنا لازمی تھا۔ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ ادب اور زندگی کا بھی بٹوارہ ہوگیا زندگی نے نئی کروٹیں بدلیں اور ادب نے نیا راستہ اختیار کیا - ہمارے فنکار اس انقلابِ عظیم سے کس قدر متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان کی موجودہ تخلیقات سے لگایا جاسکتا ہے -

۱۹۴۷ء میں تقسیم بنگال کے زیرِ اثر اکثر اربابِ علم و ادب مغربی بنگال سے مشرقی بنگال کے ڈھاکہ، چاٹگام، سلہٹ - کھلنا اور دیگر مقامات میں منتقل ہو چکے ہیں - کلکتہ کے اربابِ ذوق کے علاوہ بہار اور یو۔ پی کے اکثر مشہور اور ہونہار شعراء و ادباء نے بھی مشرقی بنگال میں سکونت اختیار کرلی ہے جو اپنے اپنے طور پر اردو زبان کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت میں مصروف ہیں - سچ تو یہ ہے کہ انھیں کی بدولت مشرقی بنگال میں اردو زبان و ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے - خصوصاً ڈھاکہ کی موجودہ ادبی سرگرمیاں اس بات

کی ضامن ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ڈھاکہ بھی اپنی روایاتی شان کی طرح اردو کے بڑے مرکزوں میں شمار ہونے لگے گا۔

'چوتھا دور' عصر حاضر کے شعراء و ادباء پر مشتمل ہے جنھیں حسب ذیل چار گروپ میں بلحاظِ عمر، مشقِ سخن و معیارِ شاعری تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا گروپ ــــ دورِ حاضر کے اساتذہ کا حال مثلاً رضا علی وحشت۔ ابوالکلام آزاد۔ ناطق لکھنوی۔ عندلیب شادانی ــــ شرف الحسین شرف وغیرہ۔

دوسرا گروپ ــــ وہ شعرائے کرام جو موجودہ دور کے اساتذہ کے بعد صرف اساتذہ میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ مثلاً جمیل مظہری، آصف، واصف پروفیسر بیخود وغیرہ۔

تیسرا گروپ ــــ ان شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے جن کی مشقِ سخن تقریباً بیس[۲۰] پچیس[۲۵] سال سے جاری ہے۔

چوتھا گروپ ــــ ابھرتے ہوئے نوجوان شعراء و انشاء پرداز کا مختصر حال جن کو ادبی عمر کم از کم دس سال اور زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہے۔

پہلا گروپ

چوتھا دور

آزاد محی الدین احمد نام ابوالکلام کنیت، آزاد تخلص۔ امام الہند لقب۔ آبائی وطن دہلی۔ آزاد کے والد ماجد مولانا خیر الدین مرحوم سنہ ۵۷ء کے غدر دہلی کے بعد سرزمین حجاز تشریف لے گئے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت باسعادت بمقام مقدس مکہ معظمہ سنہ ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور سرزمین بنگال کے شہر کلکتہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ مولانا آزاد اپنے نام اور ولادت سے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ غریب الدیار عہد و ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پروردہ

---

۵۱ :- تذکرہ آزاد۔ ص ۲۹۷

دیش معمورۂ تمنا وخرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی ابو الکلام ہے ـــ
۱۸۸۸ء مطابق ذو الحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد
ہوا اور تہمت حیات سے متہم الناس نیام، اذا ماتوا فانتبھوا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ اور مصرعہ ذیل
سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد!"

مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت، شہرت و عزت علمی و سیاسی زندگی کلکتہ
کی آغوش میں پروان چڑھی۔ ان کی اکثر تصانیف بھی یہیں پایۂ تکمیل کو پہنچیں
مولانا نے اکثر کلکتہ کو اپنے وطن سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"۲۳[۵۲] مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳
کی بنا پر حکم دیا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں۔
اِن الحکم الا للہ!

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا۔ ۳۰ مارچ کو کلکتہ سے کہ سالہا
سال کے مستقل قیام کی بنا پر بیجا نہیں۔ اگر وطن کہوں نکلا اور رانچی پہنچا۔

نگہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل دیار اکہ زمینداں رفتم

---

۵۲ تذکرۂ آزاد۔ صـ ۳۱۵

اس میں شبہ نہیں کہ سیاست نے ایک چوٹی کے سیاست داں کی حیثیت سے مولانا آزاد کو دنیائے ادب سے دور رکھا۔ لیکن مولانا کی فقہ، حدیث، علوم اسلامی، ادبیات، اردو، عربی و فارسی میں بے پناہ قدرت اور بے نظیر قابلیت نہ صرف مسلّم بلکہ رہتی دنیا تک زندہ جاوید رہیگی۔ مولانا کی عدیم المثال بے شمار تصانیف دنیائے علم مذہب و ادب کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا جتنے بڑے عالم اور مشہور مصنف ہیں ویسے ہی عدیم المثال مقرر بھی۔ اور صحیح معنوں میں ابوالکلام ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر میں خطیبانہ جوش اور عالمانہ وقار ہوتا ہے۔ طرز تحریر بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔ جس انداز میں وہ لکھتے ہیں اس میں اُن سے پہلے کسی نے نہیں لکھا تھا اور نہ آج تک کوئی شخص اُن کے طرز نگارش کی کامیابی کے ساتھ نقل یا تقلید کر سکا۔ مولانا کو انتخاب الفاظ میں بڑا کمال حاصل ہے۔ عربی کے دقیق سے دقیق الفاظ، فارسی کی لطیف سے لطیف ترکیبیں اور اردو کے دلچسپ سے دلچسپ محاورے ایسی خوبی، بیساختگی اور نظافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ موقع و محل کے لحاظ سے اردو، فارسی و عربی زبان کے اشعار بھی جا بجا اس موزونیت اور کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ اسلوبِ نگارش میں چار چاند لگ جاتے ہیں غرضکہ آزاد اردو ادب میں اپنی انفرادیت کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف لاتعداد ہیں۔ ان کا بہترین کارنامہ قرآن مجید موجودہ دور میں علوم مشرقی و مغربی کے پیش نظر یہ ترجمہ اور تفسیر قرآن اپنی مثال آپ ہے۔

جنگ طرابلس کے زمانے میں مولانا نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار "الہلال[۱]" جاری کیا۔ الہلال کے ساتھ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ الہلال کے بعد البلاغ کا اجرا ہوا لیکن یہ زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکا۔

وحشت | سیّد رضا علی نام، وحشت تخلص، ۱۹۳۱ء میں سرکار برطانیہ کی طرف سے خطاب "خان بہادر" تفویض ہوا۔

خان بہادر پروفیسر سیّد رضا علی وحشت کے جد امجد حکیم غالب علی مرحوم نے اپنے آبائی وطن دہلی سے نکل کر ہوگلی (جو بنگال میں شہر کلکتہ کے قریب ہے) سکونت اختیار کی۔ آپ کے پدر بزرگوار حکیم مولوی شمشاد علی ہوگلی کے رہنے والے تھے۔ حکیم صاحب بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔

وحشت کی تاریخ پیدائش ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء بمقام کلکتہ ہے۔ ۱۹۰۸ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے انٹرنیس پاس کیا۔ اگرچہ یونیورسٹی کی کوئی سند نہیں رکھتے۔ لیکن بطور خود مطالعۂ کتب سے ایک امتیازی استعداد و قابلیت حاصل کر لی۔ انگریزی لڑیچر سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے۔ اس زبان میں ان کی کئی درسی کتابیں انگریزوں کو اردو سیکھنے میں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ علمی و ادبی مضامین "مسلم انسٹی ٹیوٹ ریویو" اور دیگر انگریزی کے معیاری جرائد کے ذریعہ منظر عام پر آچکے ہیں۔

کچھ عرصہ تک پرشین آفس امپریل ڈیپارٹمنٹ میں چیف مولوی

---

[۱] - الہلال پر تبصرہ "بنگال میں اردو صحافت" کے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۷ء میں جب اسلامیہ کالج کلکتہ عالم وجود میں آیا تو اردو
و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پنشن کے بعد دوبارہ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء لیڈی
برابورن کالج کے عہدۂ پروفیسری پر مامور رہے۔ آج کل ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)
میں قیام فرما ہیں۔

وحشت، علامہ اقبال، حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، جوش
ملیح آبادی۔ بیخود دہلوی اور آثر لکھنوی کے ہم عصر ہیں۔ عصر حاضر کی شاعری
میں ان کا شمار ان مغتنم نفوس میں ہوتا ہے جن کے دم سے اعتبارِ فن باقی اور
حُسنِ تغزل زندہ ہے۔

۱۸۹۶ء یعنی ۱۵ سال کی عمر سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ابوالقاسم
محمد مظہر الحق شمس مرحوم کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں جب شمس نے رحلت فرمائی
تو بجز ذوق سلیم ان کا کوئی رہنما نہ رہا۔ موزونیٔ طبع بھی رہبر صادق کا کام
کرتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وحشت نے اپنے استاد کی روش کو
چھوڑ کر مرزا غالب کے انداز بیان کو پسند کیا اور تتبع فرمانے لگے۔ اس تتبع
میں کس درجہ کامیاب ہوئے۔ وہ کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ طبیعت
کا میلان اردو سے زیادہ فارسی کی جانب تھا مگر چونکہ اس زبان میں کوئی
ہمصفیر نہ رہا اس لئے فارسی گوئی کم کردی۔ ابتداءً طبیعت کسی قدر دقت پسند
تھی لیکن اب اس روش سے اجتناب ہے۔ قدیم تغزل کے دلدادہ ہیں فارسی
ترکیبوں سے اکثر کام لیتے ہیں۔ جس سے کلام میں ایک دلکشی اور رعنائی
پیدا ہوگئی ہے۔ اس خاص روش میں انھیں وہ کمال حاصل ہے جو غالب
کے بعد کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ماہنامۂ نگار، لکھنؤ کے فاضل مدیر حضرت
نیاز فتحپوری اپنے ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر "بزم نگار" کے زیر عنوان عہدِ حاضر

کے مستند اساتذۂ سخن پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

وحشتؔ بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ اردو غزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا اور خوشنما صورت سے استعمال کرنا ۔ وفاؔ رامپوری کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے ۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت پر آجاتا ہے تو غزل بالکل برباد کر دیتا ہے ۔ لیکن وحشتؔ کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا ۔ ان کے یہاں پر یہ سب کچھ بہت توازن اور سلامت روی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں "

حیات کی سچی نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورتگری کا کام شاعری ہے اور یہی معیار قدما کا تھا اور وحشتؔ نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے ۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں پیچیدہ بیانی کی مثالیں ملتی ہیں ۔ مگر انھوں نے عموماً لطف بیان کو مضمون آفرینی پر ترجیح دی ہے ۔ غور سے دیکھنے والا آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہر ایک شعر میں مکمل مضمون ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ان کا دیوان ندرتِ مضامین ، پروازِ تخیل ، اور حسین استعارہ کے دلفریب نقوش کی فراوانی سے نگارخانۂ چین بنا ہوا ہے اور بقول شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی مرحوم ـــــ " آپ کے کلام من حیث الاغلب ، جدت ، ندرت اور پختگی ہوتی ہے ۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ترکیبیں اور طرز ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں :۔

وحشتؔ کی فطری متانت کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے ۔ کلام ایسے جذبات سے جو تہذیب و شائستگی کے خلاف تصور کئے جاتے ہیں بالکل پاک ہے ۔

سنہ ۱۹۱۰ء وحشت کا پہلا دیوان شائع ہوا۔ جس میں اکثر غزلیں ابتدائی مشق کے زمانے کی ہیں۔ دیوان کے آخر میں فارسی کلام بھی ہے اردو۔ فارسی دونوں کا مجموعہ اکثر اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ جس سے وحشت کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب دیوان وحشت چھپکر منظرِ عام پر آیا تو مولانا حالی، مولانا شبلی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی حسرت موہانی، نثر لکھنوی۔ وفا رامپوری، نظم طبا طبائی، ظہیر دہلوی شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، آزاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی۔ جیسے ماہرینِ فن اور نقادانِ سخن نے وحشت کے نام تحسین آمیز مکتوبات لکھے۔

ذیل میں چند اقوال و اشعار کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جن میں تتبعِ غالب کی طرف اشارہ ہے۔

مولانا صفی لکھنوی فرماتے ہیں ؎

شاعرِ بے مثل و نظیر آمدہ	بروشِ غالب و نیر آمدہ
فارسیش غازۂ اردوئے او	از اثرِ طبع سخن گوئے او

حضرت ظہیر دہلوی (یادگارِ ذوق) کا خیال ہے۔

"آپ کے غالب ثانی ہونے میں کوئی کلام نہیں"

مولانا شوق قدوائی لکھنوی لکھتے ہیں:۔

آج کل ہندوستان میں حضرت غالب اور میر کی تقلید کرنے والے زبان کے دعوے سے اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم۔ میں نے کم کا لفظ اس بنا پر لکھا کہ پوری تقلید حضرت غالب کے رنگ کی حضرت وحشت ہی نے کی ہے۔ اور ان کی ذاتِ واحد ہی کم کے

لفظ کی مصداق ہو سکتی ہے۔

(مخزن مئی سنہ ۱۹۱۰ء)

حضرت محشر لکھنوی رقمطراز ہیں:-

"تقلید مرزا غالب مرحوم میں جس قدر مشق کی اس کی خوبصورتی اور حسین تصویریں صفحاتِ دیوان پر جابجا پائی جاتی ہیں - فارسی ترکیبوں کے صرف کرنے میں خداداد طبیعت کو سلیقۂ خاص عطا ہوا ہے - سب سے بالاتر اور لائق تحسین یہ امر ہے بلکہ اس کو مشق کمال باکمال مشق کہنا چاہیئے کہ فارسی بندشوں میں ادائے خیال کے وقت کسی مقام میں کہیں الجھن نہیں جو مضمون ہے موتی کی طرح صاف جو تخیل ہے وہ بالکل پاک اور پاکیزہ - یہی طریقہ بلاغت کی جان اور یہی انداز فصاحت کی روح ہے -

(معیار لکھنؤ مئی سنہ ۱۹۱۰ء)

آج سے تقریباً پچاس سال پیشتر جبکہ وحشت نے تتبع غالب میں طبع آزمائی کی شروع کی تھی اپنے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی اور واقعات مابعد نے ثابت کر دیا کہ پیشین گوئی کا ایک ایک حرف صحیح تھا ؎

ترے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا غالب دوراں ہونا

غالب کا انداز بیان اس قدر مرغوب خاطر ہے اور اس کے تتبع میں اس قدر محو ہیں کہ اس حقیقت کا اظہار فخر سے فرماتے ہیں ؎

نکتہ پردازی میں وحشت پیرو غالب ہوں میں
سرمہ کو کہتا ہوں دودِ شعلۂ آواز ہے

اس راہ کی دشواری پیشِ نظر ہے پھر بھی آرزو کی خلش تو سنِ

طبع کے لئے مہمیز ہے ۔

وحشت ہمیں تتبع غالب ہے آرزو

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بایں عہد دشواری اللہ نے ان کی آرزو پوری کی اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں غالب کا رنگ بدرجۂ کمال غالب ہے اور تتبع غالب کا حق ادا کر دیا ہے ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی دیوانِ وحشت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"جب مرزا غالب مرحوم اپنی موروثی پنشن کے متعلق گورنمنٹ ہند میں استغاثہ کرنے کی غرض سے کلکتہ گئے تھے ۔ اس وقت اہل کلکتہ نے ان کے فارسی کلام پر اعتراض کیا مگر آپ نے مرزا کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے آخر کار وہ اپنا نقش لوگوں کے دلوں پر جمائے بغیر نہیں رہتی ۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا ۔ مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا ۔ سچ ہے ۔

دوران باخبر در حضور نزدیکاں بے بصر دور ۔

تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنیٰ کر دیا جائے تو آپ کے اُردو دیوان کو بلا شائبۂ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہو سکتا ۔

ذیل میں مرزا غالب اور مولانا وحشت کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے اہل ذوق بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وحشت کا کلام تتبع غالب

میں کیا مرتبہ رکھتا ہے تخیل اور حسنِ بیان کا نہایت کامیاب نمونہ ملاحظہ ہو۔

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا
طور شہید ہو گیا جلوۂ دلنواز کا

اس مطلع کے ہر ٹکڑے پر غور کیجیے پھر شعر پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیے

خستگیٔ کلیم نے نکتہ عجب سمجھا دیا!
ورنہ حریف میں بھی تھا اس فرّۂ دراز کا

حضرت غالبؔ اس واقعہ کو کسی اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

دیر ملا تھا راہ میں کعبہ کو ہم نکل گئے
جذبۂ شوق میں دماغ کس کو ہو امتیاز کا

ہمارے صبر سے پیدا تھا اک عنوان بیتابی
کبھی سر کی بھی لیتا تھا خبر جو ہاتھ دل پر تھا

نہایت فطری دپراثر تخیل ہے صبر کہاں بیتابیٔ صبر نمایاں ہو سکتی ہے۔

مبارک ہو مجھے موقع فریبِ تازہ کھانے کا
کیا ہے پھر مرے پیماں شکن نے وعدہ آنے کا

کتنی پرحسرت مبارکباد ہے۔ "میرے پیماں شکن" سے جو بات پیدا ہو گئی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

محیطِ عشق میں ہم شور طوفاں بن کے اُٹھے ہیں
ہمیں آتا نہیں اندازِ رازِ دل چھپانے کا

جگہ ایسی نہیں کی تھی خیالِ یار نے دل میں

خیال آتا جو کچھ زانوئے غم سے سر اٹھانے کا

واقعی خیال یار کی دل فریبی ایسی ہی ہوتی ہے۔ شیخ علی حزیں مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

شب داشتیم بزم خوشے با خیال تو
ہوشم خراب لذتِ گفت و شنید بود

میر کا یہ مطلع بہت مشہور ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا مگر وحشت نے بھی خوب مطلع کہا ہے ؎

وائے وہ دل جس میں تیرا غم رہا | غیر ہی کا غم ترا ہمدم رہا
مدتوں میں بھی تم نا محرم رہا | ہائے تیری آشنا بیگانگی

معشوق کی بیگانہ خوبی کا مضمون کس درجہ سلیس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے ؎

ہائے وہ عالم کسی کے حسن کا
دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا

حسن کا عالم بیان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شاعر صرف یہی کہہ کے رہ جاتا ہے کہ "دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا"۔ مگر دیدنی کی لذت بھی تو بیان نہیں ہو سکتی۔ اس لئے شاعر کہتا ہے۔ مجھ پر جو عالم رہا "دیدنی تھا" شاعر بطور خود کچھ نہیں کہتا۔ مگر سمجھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہ شعر نہیں عالم حیرت کی تصویر ہے۔

جان دینے سے مجھے دادِ وفا تھی مطلوب

بیوفا چار گھڑی بھی تو پشیماں نہ رہا

جان جیسی پیاری چیز دے کر عاشق صرف دادِ وفا چاہتا ہے مگر معشوق کو پشیمانی تک نہیں۔

کس قدر پُر حسرت شعر ہے ؎

شوق کا عالم مرا تو نے نہیں دیکھا ہنوز
بے حیا تجھ کو حیا کا امتحاں ہو جائے گا

وحشت فرماتے ہیں ؎

بیکسی پردہ دار درد ہوئی
خیر گذری کہ اپنا گھر نہ ہوا

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

غالب غربت کی موت کو پردہ پوش بیکسی فرماتے ہیں اور وحشت خود بیکسی کو "پردہ دار درد" فرماتے ہیں۔ انداز بیان میں دونوں کے ندرت اور برجستگی ہے۔

دل کہ آب عمر ترا میکدۂ ناز رہا
ہائے اس خانۂ آباد کا ویراں ہونا

میکدۂ ناز، کس قدر کیف انگیز ترکیب ہے ؎

اللہ اللہ یہ کافر نظری کا عالم
زیب دیتا ہی تجھے دشمنِ ایماں ہونا

کافر نظری، کی ترکیب اور دوسرے مصرع کی برجستگی قابل داد ہے۔

مندرجۂ ذیل اشعار تو بالکل غالبؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ؎

دل کو مرغوب ہدف تیر کا تیرے بننا
سر کو منظور تری تیغ کے قرباں ہونا
کیا نظر آئے اسے حسن کو نظر آیا ہو
تیرے رُخ پر تری زلفوں کا پریشاں ہونا

میرؔ کی زبان اور تخیل کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

بہت حسرت افزا ہے شمعِ مزار
بجھایا مجھے جب جلایا چراغ

بگڑے جو اپنی بات تو قسمت سے کیا بنے
آئے کسی پہ دل تو طبیعت ہی کیا کرے

ہاں نہ دینا فرصتِ نظارہ اے شانِ جمال
ہوش کھونے ہی کی خاطر ہوش میں آتا ہوں میں

اُن کے آنے کا بھروسہ ہو نہ ہو
راہ ہم ان کی مگر دیکھا کریں

محویتِ شوق کی انتہائی کیفیت کو حیرت انگیز انداز میں بیان فرمایا اور دونوں شعروں کا سوز و گداز اور ترنم ملاحظہ فرمایئے۔ بھاشا کا لطف آئے گا۔

خوشی کی تجھے زندگانی مبارک
مجھے زندگی سے خفا کرنے والے
نہ ہو رنج سے میرے افسردہ خاطر
مجھے رنج میں مبتلا کرنے والے

اس صید ناتواں کو جو چھوٹا ہو دام سے
آزاد کیوں کہوں کہ گرفتار بھی تو ہے

حضرت مبارک عظیم آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

تو نے صیاد کچھ اس طرح سے آزاد کیا
جو چلے چھوٹ کے قفس سے وہ گرفتار چلے

غالبؔ کا شعر ہے ؎

یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں

وحشتؔ فرماتے ہیں ؎

زباں کو آشنا کر آج ذوقِ آتشِ تر سے
کہ لذت یاب ہونا ہے تجھے کل آب کوثر سے

مرزا کے شعر میں کس قدر پیچیدگی لیکن برجستگی ہے اور مولانا کے شعر میں صفائی اور زور استدلال ہے۔

آجکل ہماری نظم و نثر میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے مگر ان میں غالبؔ کا رنگ کہاں برعکس اس کے کلام وحشتؔ ملاحظہ فرمایئے۔ اسلوب بیان میں وہی برجستگی، بندشوں میں وہی پختگی اور ترکیبوں میں وہی بانکپن اور برجستگی۔ الفاظ کی نشست اسقدر بے تکلف اور مناسب ہے کہ روح کو بالیدگی ہوتی ہے۔ جو مصرعہ ہے ڈھلا ہوا۔ جو شعر ہے اعلیٰ صناعی کا مکمل نمونہ، دور از کار مبالغوں فرسودہ تخیلات اور مذموم اشارات سے آپنے اپنے دامن کو آسودہ ہونے نہ دیا۔

وحشتؔ غزل گوئی کے علاوہ اصناف رباعی، مسدس، مخمس، قصیدہ اور طرز جدید کی نظم میں بھی کامل قدرت رکھتے ہیں چنانچہ ہر صنف سخن میں انکی پختہ مشقی اور استادانہ رنگ پورے طور پر کار فرما ہوتا ہے۔ ایک نظم کے دو بند پیش کرتا ہوں۔

مرزا غالبؔ کی یاد میں فرماتے ہیں ؎

ظہوری ہو کہ طالبؔ تیرے دل کا راز کیا سمجھے
ادا دانی کو تیری عرفی شیراز کیا سمجھے
حزیںؔ یہ شیوۂ فکر چمن پرداز کیا سمجھے

نزی ترکیب کیا جانے ترے انداز کیا سمجھے
ہوا ہے اشک افزائے عجم ہندوستاں تجھ سے
بنی یہ سرزمیں دلّی کی گویا اصفہاں تجھ سے
عبارت تیری کیا ہے سرمۂ تضمین ہے گویا
کلام جانفزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا
جو تیرا نالہ ہے وہ نالے کی تاثیر ہے گویا
حکایت ہے ترے لب پر غم جانسوز ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

اُردو شاعری جس قدر وحشتؔ کی رہین منت ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن فارسی شاعری بھی آپ کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں۔ فارسی زبان اپنی جن خصوصیات کے لئے ممتاز ہے۔ وحشتؔ کے کلام میں وہ خصوصیات بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ فارسی میں شعر کہنا دشوار نہیں مگر فارسیت پیدا کرنا مشکل ہے۔ ہندوستانی فارسی شعراء کے کلام سے ہندیت کی بو نہیں جاتی مگر وحشتؔ کا شمار بلاشبہ ان فخر ہند شعراء میں ہے جن کا کلام اس عیب سے پاک ہے ؎

دلم از مستیٔ آں نرگس مستانہ می رقصد
کہ از ذوق سرِ وِش کعبہ و بتخانہ می رقصد
نہ تنہا از نشاط مے ہمیں پیمانہ می رقصد
برقص آئینہ چوں ساغر کشاں میخانہ می رقصد
کرامیں گیسوے برہم مرا آراستن دارد

کہ یارب در کفِ مشاطۂ شب شانہ می رقصد

چو از حد بگذرد سوزِ محبت اشک وا سوزد

بہ بزمِ سوختن پروانہ با پروانہ می رقصد

ہمانا شوخیٔ نازش مرا تعلیم فرما شد

پتہ در سینہ دل گوئی کہ بیتابانہ می رقصد

خوش آں محفل کہ روشن می کند شمعِ جمال رو

سپند آسا دراں جا وحشتِ دیوانہ می رقصد

شیخ علی حزیں، مولانا حالی، مرزا غالب، غنیمت، ولی دکنی، ملک الشعراء صادق خاں اختر، سید محمود آزاد، عبدالغفور خاں نساخ، داغ دہلوی کے کلام پر ان کے محققانہ تبصرے گرانقدر ادبی مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب کے سب اُردوے معلیٰ، دکن ریویو، مخزن، نقاد، وغیرہ جیسے بلند معیاری رسالوں میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں وحشت کا دوسرا دیوان "ترانۂ وحشت" لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

وحشت کے شاگرد ہند و پاک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں میجر مرزا جعفر کشفی ایم۔اے، پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی ایم۔اے (مرحوم) پروفیسر عباس علی خاں بیخود ایم۔اے کیپٹن صدیقی (مرحوم) ایم۔اے۔بی ٹی۔ امیران سلام ایم۔اے پروفیسر اختر حسین اختر ایم۔اے۔ سید محمود طرزی۔ قربان علی بصری، طاہر علی شاکر۔ ڈاکٹر طاہر، حافظ اسلم فطرت مرحوم (خمخانہ جاوید میں جن کا تذکرہ ہے) واقف بہاری مرحوم ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی، ایم۔اے، بی۔سی۔ایس، علامہ جمیل مظہری ایم۔اے

مولانا محمود اسرائیلی لاہوری۔ پیرزادہ سید ظفر ہاشمی، کوکب مراد آبادی، بیدل عظیم آبادی، عبدالرحمن آصف، محمد سلیمان واصف وغیرہ قابل ستائش ہیں اور اردو ادب میں خاص درجے کے مالک ہیں۔ ان میں اکثر معروف اور بعض غیر معروف ہیں۔

وحشت کے متعلق حضرت ناطق لکھنوی مرحوم کی صرف دو رباعیاں پیش کرتا ہوں جس کا ہر لفظ وحشت کے کمال اور ناطق کے خلوص کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہمعصروں اور ہم چشموں میں ایسا خلوص کم یاب ہوتا ہے [۵۱]

وہ جوہر پنہاں کہ جو مستور نہیں	وحشت کے سوا اوروں کا مقدور نہیں
اوصاف پہ ہے ان کے ہمیں ناز مگر	وہ اپنے کمالات پہ مغرور نہیں

اس شمع کے قربان ہو اے پروانو	یہ جوہر قابل ہے اسے پہچانو
اس رنگ کے سرمست نہ پاؤگے کہیں	وحشت کی کرو قدر ارے دیوانو

ناطق نام حکیم سید ابوالعلا سعید احمد اور تخلص ناطق ہے۔ ناطق لکھنوی [۵۲] کا سنہ ولادت ۱۸۷۸ء بمقام لکھنؤ ہے۔ تعلیم و تربیت بھی لکھنؤ میں پائی۔ نحو مولانا محمد اکرم ابن مولانا محمد نعیم قدس سرہٗ ہے۔ فلسفہ و منطق سید ظہور الحسن مجتہد العصر ہے۔ ادب، مولانا عبدالباقی مہاجر مکی ہے فقہ مولانا فتح محمد صاحب نائب سے پڑھی۔ علم ہئیت میں شرح چغمی مولوی لطف اللہ متوطن علی گڈھ سے مکرر پڑھی جو حیدر آباد دکن کے مفتی تھے۔ طب کی تعلیم

---

۵۱ سالنامہ جدید اردو کلکتہ ۱۹۴۱ء

۵۲ ناطق لکھنوی کے حالات ان کی کتاب نظم اردو سے ماخوذ ہیں۔

حکیم عبد المجید خاں خلف اکبر حکیم محمود خاں سے حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ علاوہ علوم کے انھیں تصوف سے خاص مناسبت تھی اور نجوم و جفر میں بھی قابلیت رکھتے تھے۔ خوشنویسی میں کمال اور خط شفیعہ اور طغرا میں خاص ملکہ تھا۔

ابتدا میں تصنیف و تالیف کو ذریعۂ معاش قرار دیا۔ اخبار نور الانوار مطبع نظامی کانپور کے ایڈیٹر رہے پھر سرور فار الامراء اقبال الدولہ مرحوم نے حیدر آباد دکن میں اخبار ملک و ملت کی ادارت کے لئے طلب کیا۔ یہ خدمت کئی سال تک انجام دیتے رہے۔

طالب علمی کے زمانے ہی سے فارسی عربی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ نواب بہادر حسین خاں انجم نے اُردو شعر کہنے کا شوق دلایا۔ ہر صنف شاعری میں یکساں مناسبت رکھتے تھے۔ ادبیات کی نکتہ رسی میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ تقریر و تحریر نظم و نثر پر یکساں قابو تھا۔

بقول حضرت آثر لکھنوی "جدید دور غزل گوئی کا سنگِ بنیاد حضرت ناطق نے رکھا اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو داں طبقہ کو فن نقد سے روشناس کیا۔"

ناطق لکھنوی نے ۱۹۵۱ء میں "چاٹگام" ۔ مشرقی بنگال میں رحلت فرمائی اس سے قبل تیس ۳۰ سال تک کلکتہ میں برابر مقیم رہے۔ حق تو یہ ہے کہ کلکتہ کا ادبی ماحول وحشت و آرزو کی طرح ناطق کی شیریں کلامی سے بھی ہمیشہ متاثر و فیضیاب رہا۔ وحشت اور ناطق کے تعلقات نہ صرف خاص بلکہ بہت گہرے تھے۔ ایک دوسرے سے اس قدر محبت فرماتے تھے کہ ہر محفل و بزم میں دونوں ایک ساتھ ہمنشین و ہم رکاب نظر آتے اور ایک دوسرے کا ذکر نہایت محبت،

خلوص اور مسرت کے ساتھ کیا کرتے۔

ناطق کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک مبسوط مضمون درکار ہے۔ لہذا صرف ایک غزل پیش کرتا ہوں۔ جسے انھوں نے کلکتہ کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی ؎

اثر ہے سب پہ مرے عشق کا جداگانہ — کسی کو نشہ نہیں ہے کوئی ہے دیوانہ
تمہیں ہو بزم میں کیوں ذکرِ شمع و پروانہ — یہ کیا کہیں گے ہمارا تمہارا افسانہ
نہ قطرہ کم ہے نہ کافی تمام میخانہ — جو ظرف جسکا ہو اس کا وہی ہو پیمانہ
کبھی جو آپ میں آیا بھی تیرا دیوانہ — تو جس طرح کوئی پردیس میں ہو بیگانہ
تجلیوں میں ہو تقسیم خاکِ دل کیونکر — ہزار شمع فروزاں اور ایک پروانہ
بیانِ زخمِ جگر پر وہ مسکراتے ہیں — ہنسی ہنسی میں بدلتے ہیں رنگ افسانہ
کسی کا زخم کسی زخم سے نہیں ملتا — تری نگہ کے ہیں رخ کس قدر جداگانہ
فروغِ بزمِ وفا ہے بس اک شررِ دل کا — اسی کو شمع سمجھئے اسی کو پروانہ
ہر ایک ذرہ شرابی ہر ایک قطرہ شراب — تمام عالمِ امکاں ہے ایک میخانہ
جہاں نما تو ہے ساقی نما نہیں ناطق — بدل کے لے گیا جمشید میرا پیمانہ

ناطق کا یہ شعر بہت مشہور اور بے نظیر ہے ؎

کہہ رہا ہے موجِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ناطق لکھنوی نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھی ہیں۔ سید عبداللہ علم کانپوری اور محمد حافظ خاں نے کچھ تصانیف شائع کی ہیں۔ تاریخ جنگ ہفت روزہ۔ افسانہ شہر آشوب لندن۔ بستان معرفت اسرار حقیقت ان کی تصانیف ہیں۔ علم الانساب میں نہایت محنت سے ایک شجرہ ترتیب

دیا تھا۔ جن میں حضرت آدم سے اپنے زمانے تک جتنے مشاہیر گذرے ہیں سب کے نام مسلسل ہیں۔ آجتک ایسا عظیم الشان شجرہ نظر سے نہیں گذرا۔

"نظم اردو، ان کا بے نظیر، یگانہ روزگار اور غیر فانی کارنامہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مسدس کے ستاون ۵۷ بندوں میں اردو نظم و نثر کی پونے سات سو سال کی مکمل تاریخ منضبط ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبداللہ عمادی (جامعہ عثمانیہ) محمد اسمٰعیل ہمدانی، زاہد القادری مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں، ڈاکٹر ذاکر حسین۔ آثر لکھنوی، محوی صدیقی لکھنوی، خواجہ حسن نظامی، وحشت کلکتوی جیسے مشاہیر اردو کی گرانقدر آراء شامل ہیں۔ اور یہ لائے ناطق کی شاعرانہ عظمت، محققانہ قابلیت اور علمی صلاحیت کی آئینہ دار ہے۔

حضرت آثر لکھنوی فرماتے ہیں ؎

"مشق کے علاوہ دو طرح کے حواشی ہیں ایک میں اُن شاعروں کا نمونۂ کلام ہے جن کے تذکرے سے کتاب مزین ہے اور دوسرے میں بیحد مفید اور تحقیقی تاریخی نوٹ ہیں یہ حاشیئے بجائے خود ایک مبسوط اور قابل قدر کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں لطف یہ ہے کہ نظم خشک اور پھیکی نہیں بلکہ شاعرانہ لطافتوں اور رنگینیوں سے مالا مال ہے۔ ایک ایک بند تاریخی اور لسانی نکات اور معلومات کا گلدستہ ہے، پوری نظم کا تجزیہ اس کے مطالب کی ترتیب واقعات کا سلسلہ وار تاریخی ارتقاء ان امور کی سرسری وضاحت کے لئے بھی ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔"

بطور نمونہ دو بند ملاحظہ ہو ؎

گفتگو ناطق یہ ہے آغاز اُردو کب ہوا ۔۔۔ جستجو یہ ہے کہ ظاہر راز اردو کب ہوا

ساز بزم ہند ہم آوازِ اُردو کب ہوا
انجمن میں نغمہ آرا سازِ اُردو کب ہوا

ایک ہی دُھن سُنتے سُنتے ہوگئے ہیں کان سُن
دعویٔ ایجاد اُردو کی لگی ہے سب کو دُھن

نقش یوں بیٹھا اودھ میں نام اُردو چل گیا
اس طرح کام اس کا چلتے چلتے ہر سو چل گیا

حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا
تھے بہارے بزم دل خیران یہ قابو چل گیا

حشر آغا محمد شاہ جو دنیائے علم و ادب میں آغا حشر کاشمیری کے نام سے مشہور ہیں آغا محمد غنی شاہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ ان کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ یکم اپریل ۱۸۷۹ء بمقام شہر بنارس ہوئی۔

آغا حشر کاشمیری کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسلامی رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ قرآن مجید اور فارسی و عربی کا درس گھر پر مکمل کیا۔ بنارس کے جے نراین ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت تک انگریزی کی تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ اپنی خداداد ذہانت اور غیر معمولی ذوق و شوق کے باعث درس کتابوں کے قید و بند سے آزاد ہوگئے اور بطور خود اتنا مطالعہ کیا کہ فارسی، عربی، اردو اور ہندی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل کرلی۔ انگریزی لٹریچر سے بھی خاص شغف تھا جس کا ثبوت ان کے ترجمہ شدہ ڈراموں سے بخوبی ملتا ہے۔

آغا حشر اردو زبان کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار ہی نہ تھے ایک باکمال شاعر، عظیم فن کار، اور زبردست مقرر بھی تھے۔

حشر کا سب سے پہلا ڈرامہ "آفتاب محبت" ہے جو ۱۸۹۷ء

میں لکھا گیا ہے۔ عبدالکریم خان نامی پبلشر نے اس ڈرامے کے صرف مبلغ چودہ روپے کے عوض حق اشاعت خرید کر اسے شائع کردیا جس کے منظر عام پر آتے ہی اسٹیج کی دنیا میں محشر بپا ہو گیا۔ اس کے بعد حشر کے جتنے ڈرامے اسٹیج اور اسکرین کے ذریعہ منظر عام پر آئے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

مرید شک، اسیر حرص، صید ہوس، خوبصورت بلا، سفید خون بلوا منگل، (سورداس) بن دیوی، گنگا اوترن، یہودی کی لڑکی، آنکھ کا نشہ، ترکی حور، دھرتی بالک، دل کی پیاس، سیتا بن باس، پہلا پیار، ہندوستان، شردن کمار، بھارتی، بھیشم پرتگیا، شیریں فرہاد، عورت کا پیار، قسمت کا شکار، چنڈی داس، دل کی آگ، بھگت کبیر وغیرہ۔ آخری ڈرامہ رستم و سہراب ہے۔

حشر جب ۲۲ سال کے تھے تو ۱۹۰۱ء میں بمبئی آگئے۔ اور وہاں کے اسٹیج کے لئے ڈرامے لکھتے رہے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۷ء تک برابر کلکتہ میں مقیم رہے گویا ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سرزمین بنگال میں گذرا کلکتہ میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی، کورنتھن تھیٹرز اور نیو تھیٹرز سے وابستہ رہے۔

حشر کی ذات نہایت رنگین اور دلچسپ تھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے اسٹیج بحیثیت ڈرامہ نویس اور ہدایت کار

اسٹیج کی بڑی اصلاح کی اور اردو ادب میں ڈرامہ نویسی کا ایک نیا راستہ نکالا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حشر اپنی تخلیقات اپنے قلم سے شاذ و نادر ہی لکھا کرتے تھے بلکہ ان کا معمول تھا کہ وہ عالم بیخودی میں

ٹہل ٹہل کر بولتے جاتے اور ان کے صنعتی ضبط تحریر میں لائے جاتے۔
۱۹۳۴ء میں جب حشر کی صحت خراب رہنے لگی تو لاہور چلے گئے
جہاں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ساڑھے چھ بجے شام کے وقت رحلت فرمائی
حشر کو شاعری سے بھی فطری مناسبت تھی۔ غزل۔ نظم اور گانے
خوب لکھتے تھے۔ شاعری میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فلسفہ۔
جمالیات، ان کا خاص موضوع تھا اور اس رنگ خاص میں ان کا
کوئی حریف نہیں۔ غزلیں اور نظمیں سوز و گداز، کیف و نشاط، تاثیر و دلکشی
رعنائی و رنگینی اور جذبات و خیالات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور بقول
چراغ حسن حسرت آغا صاحب کو قدرت نے تغزل کا خاص ذوق
عطا کیا تھا" بطور نمونہ چند اشعار ہدیہ قارئین ہیں ؎

کشاکش زندگی کی ارتباط جسم و جاں تک ہے
یہ سب ہنگامۂ محفل ہماری داستاں تک ہے

خبر سے خشک ہو جائیں نہ آنسو سوزشِ دل سے
ترا غم گل بداماں دیدہ ہائے خونچکاں تک ہے

مٹا دے دل کو دل کی لذتِ ایذا نہ مٹنے دے
ہجوم کارواں شوق اس جنبش گراں تک ہے

لہو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ ٹپکیں گے
کریں گے ضبط مجبورِ ستم طاقت جہاں تک ہے

یہی آکر لبِ شاعر پہ شعرِ گرم بنتا ہے
وہ سوزِ زندگی جو شعلہ زن دل سے زباں تک ہے

عندلیب نام وجاہت حسین تخلص عندلیب - ولادت یکم مارچ ۱۹۰۴ء وطن رام پور - یو۔پی - انڈیا۔

سید اولاد حسین شاداںؔ بلگرامی پروفیسر مدرسہ عالیہ رام پور سے فارسی پڑھی اور ان ہی کے تخلص کی مناسبت سے اپنے آپ کو شادانی لکھنے لگے اور رفتہ رفتہ عندلیب شادانی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں۔ غالباً رسم کی بنا پر لڑکپن ہی میں عندلیب تخلص اختیار کر لیا تھا۔ چونکہ غزلوں میں مقطع نہیں لکھتے اس لئے اشعار میں اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔

مدرسۂ عالیہ رامپور سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحاناتِ منشی عالم اور منشی فاضل سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں علی الترتیب پاس کئے اور دونوں امتحانوں میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں میٹریکولیشن سنہ ۱۹۲۳ء میں انٹرمیڈیٹ اور سنہ ۱۹۲۵ء میں بی۔اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں لندن یونیورسٹی سے فارسی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔

ملازمت ـــــ سب سے پہلے سنہ ۱۹۲۱ء میں چند ماہ خالصہ ہائی اسکول گڑھ والہ ضلع ہشیارپور میں اور اس کے بعد کچھ مدت اسلامیہ اسکول بریلی میں ہیڈ مولوی رہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں کچھ دنوں ایچی سن چیف کالج لاہور میں ملازمت کی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ریاست دجانہ ضلع رہتک پنجاب کے نابالغ نواب کے اتالیق اور سنہ ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ڈھاکہ میں اردو اور

فارسی کے سینیر لکچرار ہو کر آئے۔ لکچرار سے ریڈر اور ریڈر سے پروفیسر بنائے گئے اور اب چند سال سے اسی عہدے پر مامور ہیں۔ دو مرتبہ ایران کی سیاحت کی۔ پہلی بار سنہ ۱۹۳۰ء میں اور دوسری بار سنہ ۱۹۵۲ء میں۔

تصانیف :- ترجمہ انشائے ابوالفضل دفتر اول۔ ترجمہ چہار مقالہ۔ مقالۂ اول۔ ترجمہ رباعیات باباطاہر وغیرہ اور فارسی جدید کا لغت "نقش بدیع"۔ یہ طالب علمی کے زمانے کی تالیفات ہیں۔

ایک مدت تک 'پریم پجاری' کے روپ میں سچی کہانیاں لکھتے رہے جو ماہنامہ ساقی دہلی میں شائع ہوتی رہیں اور منتخبہ پسند کی گئیں "سچی کہانیاں" مجموعی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

افسانوں اور مقالات کے مجموعے 'نوش و نیش'، 'جھوٹا خدا'، تحقیقات'، 'دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی اور ایک مجموعۂ کلام نشاط رفتہ' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں مکمل کر چکے ہیں جو اشاعت کی منتظر ہیں۔

ڈاکٹر شادانی ۲۰ سال سے ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ ان کے دم سے مشرقی پاکستان میں اردو نے بڑی ترقی کی سنہ ۱۹۴۷ء ایک روزنامہ "مشرقی پاکستان" اور سنہ ۱۹۵۲ء میں ماہنامہ خاور جاری کیا۔ اب دونوں بند ہو چکے ہیں۔

شاعری :- ڈاکٹر شادانی اپنی سرگذشتِ شاعری[1] یوں تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] تذکرۂ شعرستان، مرتبہ مظہر صدیقی صفحہ ۲۶۵

میری شاعری کی ابتدا ر نظم سے ہوئی اور تصویر بہار، میری پہلی نظم ہے جو دیال سنگھ کالج لاہور کی بزم ادب کے ایک جلسے میں ۲۹ جنوری ۱۹۲۴ء کو پڑھی گئی۔ سامعین کی بے اختیار داد تحسین نے دل بڑھایا۔ اور میری دوسری نظم، شالامار، وجود میں آئی۔ اس نظم نے گمنام نوارد کے لاہور کے ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس کرا دیا۔

۲۵ مئی ۱۹۲۵ء کو حقیقی زندگی" اور اس کے ساتھ ہی حقیقی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے ؎

گو ہے ہوا ہی سے پردہ حریم ناز — دل یہی سمجھتا ہے شوق کارفرما ہے

میری شاعری کو دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جنوری ۱۹۲۴ء سے لے کر اگست ۱۹۲۹ء تک اور دوسرا دور جولائی ۱۹۳۴ء سے لے کر آج تک دونوں دوروں کے درمیان تقریباً پانچ برس کا زمانہ بالکل خاموشی میں گذرا۔ ہاں دسمبر ۱۹۳۱ء میں ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر ایک نظم "سی نوری تا" لندن میں کہی تھی۔ اس کے بعد پھر مکمل خاموشی رہی۔ ۱۹۳۴ء میں یکایک احساس نے انگڑائی لی اور یہ غزل وجود میں آئی ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں — انھیں کی یاد میری زندگی ہے

میری شاعری تمام تر حال ہے، اور پہلے دور کی بعض نظموں کو چھوڑ کر، وہ بھی بیان واقعہ سے خالی نہیں۔ میں نے زندگی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جس پر آپ بیتی کا اطلاق نہ ہو سکے ؎

اوّل سے لے کر آخر تک رنگین ہے میرا افسانہ
کچھ اس کے لبوں کی سرخی سے کچھ میرے لہو کی سرخی ہے

نمونۂ کلام

چاندنی سے گلوں سے نغموں سے
جی بھر آتا ہے کیوں خدا جانے

بیٹھے بیٹھے امنڈ نے لگتا ہے
دل کو کیا ہو گیا خدا جانے

آہ کی قدر اشک کی قیمت
کوئی غم ناشناس کیا جانے

زخم دل کو چھپا رہا ہوں میں
کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

چاندنی اور اداس تنہائی
غم ہو کس حال میں خدا جانے

بدگمانی ہے عبث میری خموشی سے تمہیں
کیا کبھی تار سے نغمہ بھی جدا ہوتا ہے

ایک شعلہ ہے کہ سینے میں لپکتا ہے مدام
شاید اتنا ہی محبت کا صلہ ہوتا ہے

جھانکنا چاند سے نغموں سے صدائیں دینا
اے میری روح کی تسکین یہ کیا ہوتا ہے

دل آج بیحد گھبرا رہا ہے
اے دوست ان کا کچھ تذکرہ کر

توڑ دیئے ہوں یاس نے جس کے تمام آسرے
آہ وہ نامراد پھر کیا کوئی آرزو کرے

بہت مختصر تھے محبت کے لمحے
مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا

بے نیازانہ برابر سے گذرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں

محبت دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو آہ کیسی زندگی ہے

رشک کرتی ہے مجھ پر اک دنیا
شعر ہو نغمہ ہو بہار ہو تم

دل سے اک دھواں اٹھا آنکھ ڈبڈبا آئی
انتظار کی آخر کوئی انتہا بھی ہے

کیفی، تمنا، آثر

تقسیم ہند کے زیر اثر اردو کی جو بڑی ہستیاں بنگال کے حصے میں آئیں۔ اُن میں علامہ کیفی چڑیاکوٹی، مولانا تمنا عمادی پھلواری اور آثر ردولوی بھی قابل ذکر ہیں۔

کیفی چڑیاکوٹ اعظم گڈھ یوپی کے رہنے والے ہیں۔ تقسیم سے پہلے کلکتہ میں اکثر ان کا قیام رہا۔ وہاں سے انھوں نے کئی رسالے بھی جاری کیے تھے اب تقسیم کے بعد مشرقی بنگال ڈھاکہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ تمنا عمادی کا وطن صوبۂ بہار کے ایک مقام پھلواری شریف ضلع پٹنہ ہے کلکتہ میں مدت تک ان کا قیام رہا۔ اب ڈھاکہ ان کا وطن ثانی ہے۔ آثر ردولوی تلمیذ حضرت امیر مینائی یادگار سلف بزرگ ہیں۔ پندرہ سال سے کلکتہ میں مستقل اقامت ہے۔ ان حضرات کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی ایک ایک غزل قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش ہے ؎

کیفی :-

میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں
محبت کے ہر دام پر بیچتا ہوں

دعا رسحر ہو اگر لینے والی
میں اشکوں کے اپنے گہر بیچتا ہوں

چکادے کوئی دل کا سودا چکا دے
خریدار غم ہوں اثر بیچتا ہوں

اِدھر آ دل و دیں کے اے لینے والے
میں اب کچھ سر رہگذر بیچتا ہوں

قسم ہے قسم ناز خنجر کی مجھکو
شہادت خرید و نگا سر بیچتا ہوں

خبر دل کی قیمت کی کیفی نہیں ہے
میں کم بخت کو بے خبر بیچتا ہوں

تمنّا:-

یہ نہ سمجھو کہ نہ اب گل ہے نہ گلشن میرا
شاخِ گل پر ابھی باقی ہے نشیمن میرا

پاسِ الفت کی قسم ہوں میں ہوا خواہ رقیب
آپ کا دوست، تو ہے لاکھ ہو دشمن میرا

ہم تو چپ سنتے ہیں منھ دیکھ کے رہجاتے ہیں
کہتے ہیں مرغِ قفس زاد بھی "گلشن میرا"

غنچہ و گل نہ سہی - خار ہیں واقف مجھ سے
پاس جاؤں تو لگیں چومنے دامن میرا

اشک سے پوچھ لے اے ولولۂ جامہ دری
آستیں میری کوئی اب ہے نہ دامن میرا

اہلِ دل رکھتے ہیں سینہ میں تمنا مجھ کو
ہوگا پتھر کوئی جو دل نہیں مسکن میرا

اثر:-

ہیں ہم نہاں پیدا سرمستئ صہبا سے
اک وجد کا عالم ہے ہر نغمۂ مینا سے

باز آ دلِ پر حسرت جلوے کی تمنا ہو
آئینہ ہے ناکامی بیہوشئ موسیٰ سے

اللہ رے یہ وحشت یہ چاک گریبانی
وسعت کا میں طالب ہوں اب دامنِ صحرا سے

جس شئے پہ نظر ڈالی دیکھی تری یکتائی
انوار کی ریزش ہے ہر دیدۂ بینا سے

یوں گریہ کناں ہو کر رسوا ہمیں کردیگی
امید نہ تھی ہرگز یہ چشمِ تمنا سے

ہی جورِ تغافل سے افزائشِ بیتابی
دل محو تسلی تھا طرزِ ستم آرا سے

ہی خاطرِ مضطر سے کیوں شکوۂ بیتابی
گستاخ گیا تم نے خود نازشِ بیجا سے

بے کار اثر سمجھو تم نہ سخن آرائی
الفاظ ہوں نامحرم گر شاہد معنیٰ سے

شرف

نام سید ابوالفتح محمد شرف الدین اور تخلص شرف ہے یہ تاریخی نام (۱۲۹۵ھ) عبدالغفور خاں بہادر نساخ نے تجویز فرمایا تھا جس سے سن تاریخ ۱۲۹۵ھ نکلتا ہے۔ ادبی دنیا میں شرف الدین شرف کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد ماجد فقیہہ الدین حسین الحسینی مرحوم ڈھاکہ کے رؤسائے اعظم میں سے تھے۔ موصوف عربی و فارسی میں مدرسہ محسنیہ کے سند یافتہ تھے۔ اس مدرسہ کے پرنسپل مولانا عبیداللہ عبیدی جیسے شہرۂ آفاق عالم و فاضل تھے۔ شرف کے جد سید قیص الدین حسین الحسینی مرحوم نواب ناظم کے زمانے میں ڈھاکہ کے شہر کوتوال تھے۔

شرف الدین شرف نواب سید محمد خاں بہادر آزاد مصنفہ خیالات آزاد، و نامہ نگار اودھ پنچ، اور نواب سید محمود خاں آزاد کے بھانجے ہیں۔

شرف کا سن ولادت باسعادت ۲۱ ماہ محرم ۱۲۹۵ھ بمقام ڈھاکہ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والد مرحوم کے زیر نگرانی ہوئی۔ ۱۳۰۹ھ میں جب ان کے پدر بزرگوار کا انتقال ہوا۔ تو عبدالغفور شہباز مرحوم کے دامنِ علم و فضل سے فیض یاب ہوئے۔

ڈھاکہ ڈویژن کے کمشنر مسٹر ٹی انگلس نے شرف کے خاندانی اعزاز کا احترام کرتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں انھیں اپنے دربار میں عہدۂ خاص عطا کیا۔ ۱۹۰۷ء سے ۲۲ سال تک ڈھاکہ ڈویژن کے آنریری مجسٹریٹ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ چودہ سال تک ڈھاکہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے

رکن رہے۔ ۱۹۲۸ء سے ابتک گوشہ نشین ہیں۔

شعر و ادب میں عبدالغفور شہباز سے اکتسابِ فن کیا۔ اپنے ماموں نواب محمود آزاد اور آرزو لکھنوی جیسے اساتذہ سخن کے چشمۂ فیض سے بھی استفادہ کیا۔

شرف بزرگان سلف کی قابلِ قدر یادگار ہیں۔ ان کی ذات بابرکات سرزمین بنگال میں منفعات میں سے ہے۔ ڈھاکہ کے ایک باکمال شاعر اور مرنجانِ مرنج بزرگ ہیں۔

شرف کا پہلا دیوان ۱۹۳۶ء میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ سے طبع ہوا۔ اگست ۱۹۵۲ء میں جب میں سندھ سے ڈھاکہ گیا تو حضرت سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ انھوں ازراہِ نوازش اپنے دیوان "گلستان شرف" کا ایک نسخہ عنایت فرمایا تھا۔ "گلستانِ شرف" گلہائے رنگارنگ کا نہایت دلکش اور دلچسپ گلدستہ ہے جس کے مطالعہ سے شرف کے کمالات اور فطری قابلیت و صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

"گلستان شرف" کے چند صفحات شہرۂ آفاق ادبا و جلیل القدر شعراء مثلاً اختر حسین بی۔اے (علیگ)، پرنس محمد اکرم حسین مرحوم خلف الصدق واجد علی شاہ، سائل دہلوی۔ آرزو لکھنوی، بیخود دہلوی، وحشت کلکتوی مرزا فقیر محمد جہانگیر نگری، عبدالغنی دہلوی، صفدر علی دہلوی، ابرار دہلوی نکہت شاہجہانپوری وغیرہ کے تحسین آمیز تبصرے سے مزین ہیں۔

چند مستند ہستیوں کی آرائے گراں کا اقتباس اس خیال سے پیش کرتا ہوں کہ اہل دہلی و اہل لکھنو کی یہ آراء نبگال کے ایک صاحبِ کمال سے متعلق ہیں ہے

آرزو لکھنوی :-

دیوان شرف میں غزلوں کے ترتیبی مجموعہ کے ساتھ ساتھ قصیدے مقطع، مسدس، مثنویاں، رُباعیاں، سہرے، سلام، نوحے، تاریخیں غرضکہ سبھی کچھ موجود ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کی طبیعت میں ہر صنف سخن سے مناسبت اور ہر رنگ میں ڈوبنے کی صلاحیت موجود ہے۔ کل کلام کے مطالعہ سے دو خوبیاں اور بھی ترشح ہوتی ہیں۔

۱- ادبی انقلابوں کے ساتھ ساتھ مصنف کی تبدیلیٔ مذاق 'گلستان شرف' میں عہدِ ماضی سے لے کر زمانۂ حال تک کے سبھی رنگ موجود ہیں۔

۲ :- کلام کے فرق توازن سے تدریجی ترقی بھی اچھی طرح نمایاں ہو رہی ہے۔ غرضکہ دیوان مصنف کو ادبی قابلیت اور فطری مناسبت کا پورا پورا آئینہ دار ہے"

بیخود دہلوی :-

" اہل بنگال میں ایسی شستہ زبان کم نکلے گی۔ میرے نزدیک بنگال کے لئے ایسا شاعر بحیثیت زبان مغتنمات سے ہے"

حکیم عبد الغنی خاں دہلوی :-

" زبان شستہ اور تخیل بہت اعلیٰ ہے۔ ایک ہزار میل کے فاصلہ پر میں ہوں مگر سید صاحب کو ان کی خوبیوں کے ساتھ ہمیشہ یاد کرتا ہوں"

صفدر علی دہلوی :-

زبان نہایت شستہ کلام صاف اور بیان پاکیزہ ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا کلام اور گفتگو ایسی ہے جو زبان

دانوں کی نہیں بلکہ اہلِ زبان کا حق ہے۔"

اب گلستانِ شرف سے چند اشعار آپ کی تفننِ طبع کے لئے پیش کرتا ہوں ؎

سیاہیٔ شبِ فرقت کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا
کہ دودِ آہ دل ہمسر بنا ہے زلفِ پُرخم کا

الٰہی آمد آمد پھر ہے کسی کے تیرکی دل میں
دہانِ زخم سے جو غل ہے برپا خیر مقدم کا

ایذا ہی کے خوگر ہیں سب حسن کے دیوانے
اُف بھی تو نہیں کرتے جلتے ہوئے پروانے

ہے سازِ نشاط اپنا ٹھوکر میں زمانے کی
ٹوٹے ہوئے شیشہ میں پھوٹے ہوئے پیمانے

دل سے اغیار کو تو نے جو نکالا ہوتا
گھر میں بے شمع اندھیرے سے اجالا ہوتا

ادا ہو ور کی خاک بہلائے دل کو
یہ کمبخت طرز آشنا ہے کسی کا

دونوں ہیں شوق قتل میں بیتاب و بیقرار
کچھ امتیاز بسمل و قاتل نہیں رہا

دولت پہ ہے گھمنڈ شرافت سے ننگ و عار
حال زمانہ کہنے کے قابل نہیں رہا

قتل گہہ میں تیغ کا پانی وہ طوفاں خیز تھا
بڑھتے بڑھتے موت سے دریا کا دھارا ہو گیا

تم صدا دو تو نکل آؤں ابھی تربت سے
میں تو بیدار ہوں قسمت ابھی بیدار نہیں

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے شرق کے متعلق اپنی غزل کے مقطع میں فرمایا ہے ؎

اِک حضرتِ شرق کے سوا اب تو عندلیب
ڈھاکہ میں اور کوئی سخن داں نہیں رہا

محمود | مولوی حافظ سید محمد محمود ابن مولوی حکیم سید زین العابدین ابن مولوی سید رحمت علی کا سنِ ولادت ۱۸۹۲ء اور جائے پیدائش موضع بارو ضلع مونگیر مکافات بہار ہے۔

ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مختلف اساتذہ سے پائی۔ حفظ قرآن کریم کا مرحلہ بھی وطن میں طے ہوا۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے پانچ سال اس خرمن علم کی خوشہ چینی کی۔ دورانِ تعلیم میں سرکار دولتمدار کے وظیفہ خوار رہے مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر بغرض تکمیل حدیث تفسیر و فقہ دیوبند گئے دو برس متعلم رہ کر علوم مذکورہ کی سند حاصل کی۔

دورانِ تعلیم میں ضمنی طور سے انگریزی زبان سے بھی شغف رہا میٹرک کا امتحان تو دورانِ تعلیم میں دیا۔ آئی اے اور بی اے کے امتحانات دوران ملازمت میں پاس کئے۔ ایم اے کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن کلکتہ یونیورسٹی نے شرکت امتحان کی اجازت نہ دی۔

دیوبند سے واپسی کے بعد بی ون کالج پٹنہ میں آئی اے کلاس میں تھے

کہ مسٹر ہارلے پرنسپل مدرسہ عالیہ کی جوہر شناس نگاہوں نے انھیں اردو اور فارسی کے مدرس کی حیثیت سے انتخاب کیا چنانچہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل مدرسہ عالیہ میں بعہدۂ ہیڈ مولوی بحسن و خوبی اور نیک نامی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے اسی زمانے میں راقم الحروف کو بھی اپنے قابل ترین استاد اور شفیق بزرگ کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مدرسہ مذکور سے ملحقہ دارالاقامتہ الیسٹ ہوسٹل نامی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رہے تقسیم کے بعد کھلنا ضلع اسکول میں انکا تبادلہ ہوگیا اور یہاں دو برس خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۴۹ء میں پنشن خوار قرار پائے۔ آجکل کھلنا ہی میں مستقل قیام ہے۔ آفتاب اردو اسکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر اور گرلس کالج میں لکچرار ہیں۔

مولوی حافظ محمود کی ذاتِ گرامی اس لحاظ سے بھی زیادہ قابل قدر اور ناقابل فراموش ہے کہ یہ اُن گمنام اور خاموش ہستیوں میں سے ہیں جن کے اندر علوم و فنون کا ایک سمندر موجزن ہے جس سے بے شمار تشنگان علم اپنی تسکین کرتے ہیں اور جن کی ذاتِ بابرکات کے طفیل سے جادۂ علم و ادب پر گامزن ہوتے اور ترقی کی منزل پر سب سے اونچے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ایسی ہستیوں کا نام نہ تو کبھی دنیا کے لبوں پر آتا ہے اور نہ تاریخ کے صفحات پر کلکتہ کے سیکڑوں کیا بلکہ ہزاروں علمبردارانِ ادب موصوف کے خوشہ چیں اور زیر تعلیم و تربیت رہے۔

تعلیم و تدریس کی مصروفیت کے باوجود انھوں نے تالیف و تصنیف کا جو کام کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ مطبوعہ کتابوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:-

شمع نبی کے پروانے، ——— صحابہ کرام کی جاں نثاری کے ولولہ انگیز واقعات صحیح احادیث سے جمع کئے گئے ہیں۔

جامع القواعد، ——— یہ درحقیقت بابائے اردو مولانا عبدالحق صاحب کی مشہور کتاب قواعد اردو کی تلخیص کسی قدر اضافے کے ساتھ کی گئی ہے۔ تمام ضروری قواعد اس مختصر سی کتاب میں موجود ہیں۔

اِنتخاب ——— مشہور اربابِ قلم کے مضامین کا انتخاب اور مستند شعراء کے اصنافِ سخن کا گلدستہ ہے۔ درسی نقطۂ نظر سے لکھا گیا اور بعض مدارس میں داخل نصاب ہے۔

شعر و شاعری سے فطری ذوق ہے اردو، فارسی، دونوں زبانوں پر طبع آزمائی فرماتے ہیں لیکن باضابطہ شاعری کبھی نہیں کی۔ اس بے ضابطگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جو کچھ کہا وہ بھی محفوظ نہ رہا۔ پنج سالہ قیام کھلنا میں جو کچھ نکل گیا ہے وہ محفوظ ہے۔ اشعارِ ذیل کا انتخاب انھیں سے ہے۔

ارسطوی زمانہ اور سکندر جاہ ہوتا ہے
مگر ہوتا ہے دنیا میں کوئی انسان مشکل سے

بصیرت ہے تو اک اک ذرہ اک خورشید کامل ہے
بصارت گر نہیں حاصل ہے کیا خورشید کامل ہے

جو ہو ذوقِ عمل رہبر تو پھر آساں ہے ہر مشکل
دگر نہ ہوتا ہے آسان بھی آسان مشکل سے

نہیں مشکل زباں دینی کہ اک جنبش زباں کی ہے
مگر وعدے کے پکے ہوتے ہیں دنیا میں مشکل سے

شمع کی زندگی ہو پروانے کا ہو مرنا
جینا ہو ایسا جینا مرنا ہو ایسا مرنا

دو روزہ زندگی پر کیا جان دے رہا ہے
دو دن کی چاندنی ہے تاریک پھر زمانہ

جس کی سرشت جیسی تھی ویسا ہی وہ بنا
غفار وہ ہوا میں خطا کار ہو گیا!

یہ لذتِ گنہ نہ تھی تھی عفو کی طلب
اک فرط شوق میں میں گنہگار ہو گیا

تیرے کرم نے کر دیا گستاخ اے کریم
جو شکوہ سنج میں دم گفتار ہو گیا

اکمل اکمل علی اکمل ۱۸۷۷ء بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ اور ۴۳ء میں وفات پائی اکمل فارسی، اردو، انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی ایک انگریزی تصنیف فرسٹ لیسن ان ہندوستانی گرامر——
FIRST LISSON IN HINDUSTANI GRAMMER
انگریزی اور اردو طبقے میں بیحد مقبول ہوئی۔ شمس سے اصلاح سخن لیتے اور کلام ذوق کا تتبع فرماتے رہے کلام میں داغ کی سی سادگی کے باوجود ذوق کا رنگ غالب ہے۔ نظم۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ رباعی۔ مسدس۔ مخمس وغیرہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی جو قابل تحسین ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان کے کلام کا سب سے زیادہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلوں میں بندش، سلاست، تخیل کی بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ سادگی و پرکاری کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ طبیعت میں بلا کی موزونیت اور غضب کی روانی تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ رضا علی وحشت نے فرمایا تھا ؎

ہمطرحیٔ اکملؔ مجھے وحشتؔ عبث ہے آرزو
اک شعر تو ہوتا نہیں کہنا غزل کا اک طرف

اکملؔ کے سارے مجموعۂ کلام فارسی و اردو کو یکجا جمع کیا جائے تو دو ضخیم دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔ اب تک صرف ایک دیوان شمس پریس کلکتہ سے شائع ہو سکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

قابل قدر یا تو میں نہ رہا
یا کوئی صاحب نظر نہ ہوا

کی رہبری اندیشۂ انجام نے اکملؔ
شوقِ دلِ مضطر ابھی رہبر نہ ہوا تھا

جب سے وہ میرا شریک غم ہے اکملؔ کیا کہوں
کیا خوشی ہوتی ہے مجھ کو غم کی صورت دیکھ کر

جب پیار کی نظر سے وہ دل کو دیکھتے ہیں
ہم اپنی آنے والی مشکل کو دیکھتے ہیں

اک بزرگ اکملؔ یہ مجھ سے کہہ گئے
ہے خودی جب تک خدا ملتا نہیں

صولتؔ حبیب النبی خاں صولتؔ اپنے زمانے کے بہترین صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ شاعری سے بھی فطری مناسبت تھی۔ ماہنامہ شمسؔ جو شمسؔ مرحوم کی یادگار میں شائع ہوتا تھا۔ کہ فاضل اڈیٹر تھے یہ وہ رسالہ ہے جس میں علامہ اقبالؔ۔ حسرتؔ موہانی، وحشتؔ کلکتوی جیسے نقادانِ ادب مستقل طور پر لکھا کرتے تھے۔ صولتؔ نے شاعری میں شمسؔ کے اکتسابِ فن کیا۔

عزیزؔ عزیز النبی خاں المتخلص بہ عزیزؔ صولتؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور انھیں سے مشورۂ سخن لیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں غالباً ۶۰۔۶۵ سال کی عمر میں انھوں نے قضا کی۔ اردو، انگریزی، عربی، فارسی

بنگلہ اتنی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے سینئر لکچرار تھے - انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ بالکل نئے اور مفید انداز میں کیا - ہر ایک صفحہ پر عربی عبارت کا نہایت صاف و شستہ و بلیغ ترجمہ بیک وقت دو زبانوں اردو اور بنگلہ میں نظر آتا ہے - ایک شخص ایک نظر میں تین زبانوں کا بخوبی مطالعہ کر سکتا ہے - یہ ان کا سب سے بڑا قابل قدر کارنامہ ہے تقسیم ملک سے پہلے یعنی ۱۹۴۶ء میں جب راقم الحروف کا مسکن کلکتہ تھا اس کتاب کا آخری حصہ زیر تکمیل تھا اب انکی وفات کے بعد غالباً چھپنے سے رہ گئی

شاعری میں فارسی و عربی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے - زبان سخت ضرور معلوم ہوتی ہے مگر علمی قابلیت اور شاعرانہ رفعت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے - کوئی دیوان اب تک شائع نہیں ہوا - تصوف و فلسفہ خاص رنگ ہے جس سے کلام بھرا پڑا ہے - ایک قطعہ کے انھیں کے تین اشعار درج ذیل ہیں ؎

باعث خوشنودیٔ عالم ہے اصل جاوداں
روح کے طائر کو ملتی ہے بہارِ بے خزاں

نطفۂ انسان میں اس کی جہد کا آغاز ہے
دیکھتا ہے دیدۂ دانا جو ہر دم باز ہے

مرجع اشیائے کل ہوتا ہے بس اصل اصول
منہمک رہتا ہے اس میں ہر کوئی بہر اصول

سرور | محمد سرور خاں سرور کلکتہ کے بڑے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں ۱۸۹۰ء میں کلکتہ میں آنکھ کھولی

۱۹۱۵ء میں میٹریکولیشن اور ۱۹۱۶ء میں آئی اے پاس کیا۔ فن کتابت سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ مہارت رکھتے ہیں۔ کلکتہ کے بہترین خوشنویسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ شمس کے دو دیوان انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں اور آجکل ڈھاکہ میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں عرصہ تک لکھنؤ، خیرآباد، بسواں وغیرہ میں قیام رہا۔ جہاں مہدی حسین کمال، میرزا اکبر حسین یاس، فصاحت خلف امانت، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، منشی نوبت رائے نظر، ریاض و کوثر خیرآبادی باسط بسوانی وغیرہ کے ساتھ معرکہ آرا مشاعروں میں شرکت کی اور خوب خوب داد حاصل کرتے رہے۔

شعر و شاعری میں حاجی محمد بشیر پھلواری جو بہار کے فارسی کے باکمال سخنور تھے کی ذات بابرکات سے استفادہ کیا۔ مہاراجہ نیپال کی قدردانی کے باعث کئی سال تک درباری شاعر بھی رہے۔ اردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ ان کا ایک فارسی دیوان لکھنؤ میں چھپ چکا ہے۔ فارسی کلام صائب شیرازی، غنی کاشمیری، ناصر سرہندی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو کے متعدد ضخیم دواوین اور دیگر غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ ان کے کلام کا رنگ وہی ہے۔ جو امیر مینائی، آتش و صبا لکھنوی کا ہے۔ رعایت لفظی، سلاست، فصاحت، روانی، صفائی، شگفتگی، درد و اثر، سوز و گداز کلام کی خصوصیات ہیں۔

ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

چوکھٹ پہ فرشتے بھی بھٹکنے نہیں پاتے
گھر ان کا کہیں عرشِ معلیٰ تو نہیں ہے

وحشت کا ٹھکانا کروں اس میں کہ جنوں کا
اک دل ہے مرے سینہ میں صحرا تو نہیں ہے

یہ سنتا ہوں کہ برق سی چمکی تھی سرِ طور
یہ قصۂ بیہوشیٔ موسیٰ تو نہیں ہے

کیوں سامنا ہر وقت ہے اک تازہ ستم کا
عقبیٰ کہیں یارب میری دنیا تو نہیں ہے

ممکن ہے نہ دل تھام کے رہ جائے وہ قاتل
بسمل کا تڑپنا ہے تماشا تو نہیں ہے

تجھے وہ بھی حسیں تیری طرح کیسے یقیں ہو
یوسف کو سنا ہم نے ہے دیکھا تو نہیں ہے

خالق کے سوا خلق کی منت نہ ہو سرور
سب بندے ہیں ان میں کوئی مولا تو نہیں ہے

فقیر محمد مرزا فقیر محمد ڈھاکہ کے نواب خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور مشرقی بنگال کے قابل قدر بزرگوں میں سے ایک ہیں۔ عمر کوئی ۸۰-۸۵ کے لگ بھگ ہوگی۔ مرزا داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ خوش فکر شاعر اور اچھے انشا پرداز ہیں۔ تمام عمر مشرقی بنگال میں رہ کر اردو زبان و ادب کی خاموش مگر ناقابلِ فراموش خدمت انجام دیتے رہے۔ مشاہیر سے ان کو ہمیشہ راہ و رسم رہی اور بذریعہ خط و کتابت تعلقات کا سلسلہ قائم رہا۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگِ خط کا اقتباس ذیل میں پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ نہ صرف اہلِ بنگال بنگلہ بلکہ سارے برِصغیر کو اہلِ ہند نے ان کے

طرزِ تحریر کو بحد پسند کیا۔ یہ خط ۲۹ سال قبل لکھا گیا تھا اور اب تو ادرِ ادب میں سے ایک ہے ؎

الہ آباد۔ ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء

کرمی السلام علیکم و رحمتہ اللہ

آپ کی تحریر ایسی اچھی ہے کہ اگر ناتوانی مانع نہ ہوتی تو داد دینے کو خود حاضر ہوتا ایں طرزِ خیالی اور اس زبان پر تو خود دلی اور لکھنؤ کو ناز ہو سکتا ہے۔ آپکا دل و دماغ اور آپ کی زبان و طبیعت جہاں ہے وہ بنگالی نہیں ہے۔ آپ نے میری قدر افزائی کی ہے خدا خوش رکھے میں اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں سمجھتا۔

دعائے خیر کا طالب
اکبر حسین

انتخابِ کلام :-

سنگِ در ہے ترا سودائی ہے
عشق ہے عشق کی رسوائی ہے

پتے پتے پر تمھارا نام ہے
ذرہ ذرہ حاملِ الہام ہے

تیری خوشی کو ہم اپنی خوشی بنا نہ سکے
ہزار حیف کے احساسِ غم ہٹا نہ سکے

ہم آئینہ میں عکسِ نظر دیکھتے رہے
کس رخ کو دیکھنا تھا کدھر دیکھتے رہے!

ہے اختیار اشکوں کا مطلب گلہ نہیں
ناحق خفا ہو میں نے تو کچھ بھی کہا نہیں

اٹھتے ہی نقاب آج بیخود ہوئے دیوانے

لو شمع نظر آئی گرنے لگے پروانے

اے جوشِ جنوں تونے دنیا ہی بدل ڈالی
خاک اُڑتی ہے بستی میں آباد ہیں ویرانے

اس نورِ مجسم کی تصویر کے دو رخ ہیں
ظاہر کو تو ہم سمجھے باطن کو خدا جانے

عبدالمقتدر خان بہادر عبدالمقتدر ایم اے، پروفیسر احمد اشک ایم اے کے پدر بزرگوار تھے۔ انتقال غالباً ۶۰ سال کی عمر میں ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ کلکتہ کے ایک باوقار و علم دوست رئیس تھے۔

کچھ عرصہ تک کٹک (اڑیسہ) میں پروفیسر رہے پھر خدا بخش خاں کے کتب خانے میں کٹلوگر کا فرض آخری عمر تک انجام دیتے رہے۔ ان کی ساری زندگی تحقیق و تفتیش اور حدیث علم و ادب میں گزری۔ برسوں کی کاوش کے بعد فارسی کتابوں کی نہایت جامع فہرست مرتب کی تھی جو کتابی شکل میں چھپی تھی۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ کے مستشرقین نکتہ رس نے بھی اس کتاب کے متعلق تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جن سے محاسن کتاب کا اندازہ ہوتا ہے۔ تبحر علمی کے باوجود خلق، انکسار، محبت اور مروت کے مجسمہ تھے۔

نذرالاسلام قاضی نذرالاسلام ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء میں مغربی بنگال کے ایک گاؤں بنام چورولیا ضلع بردوان میں پیدا ہوئے بحیثیت شاعر انقلاب بنگالی ادب میں نذرالاسلام کا مقام بہت بلند ہے۔ ہرچند انکی تمام تر شہرت و عظمت ان کی بنگلہ شاعری اور انشا

پردازی تک محدود ہے ۔لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں
کہ وہ اردو، فارسی، عربی، زبانوں پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتے ہیں جتنی
کہ اردو کا ایک مجموعۂ کمال شاعر۔ان کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز
نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے اردو کی بڑی خدمت کی وہ بنگالی ادب
کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو، فارسی کی طرح بنگالی
زبان میں صنفِ غزلگوئی کی بنا ڈالی ۔ان کی شاعری اردو فارسی کی
حسین و دلکش ترکیبوں اور استعاروں سے مالامال ہے ۔آج جن بنگالی زبان کے
شعراء کے کلام میں اردو، فارسی کے الفاظ اور غزلوں کا سرمایہ ملتا ہے ۔یہ محض
نذرالاسلام کی اُردو نوازی کی رہین منت ہے ۔نذرالاسلام نے حافظ کی رباعیو
کا بنگالہ زبان میں ترجمہ کیا ۔عم پارہ کا مکمل ترجمہ بنگالی نظم میں کیا۔ان کی
ساری تصانیف کو پڑھ جلیئے اور دیکھئے انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش جاری
رکھی کہ بنگالی سے سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کو متروک کر کے
عام فہم اور آسان الفاظ استعمال کئے جائیں ۔اس تحریک سے ہندو،
مسلمان دونوں جماعتوں میں ایک عجیب بل چل مچ گئی تھی اخبارات
ورسائل میں ان کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے کہ نذرالاسلام اردو
اور فارسی الفاظ کے بیجا استعمال سے بنگالی زبان کو مٹانا چاہتا ہے لیکن
مخالفت جوں جوں بڑھتی گئی بنگالی ادب میں نکھار پیدا ہوتا گیا ۔نذرالاسلام
کی بیشتر نظمیں یا گیت ایسے ہیں جن کا پورا پورا شعر اردو فارسی کے الفاظ
سے بھرا پڑا ہے جس کے مطالعہ سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں نہ
صرف اردو شاعری بلکہ اس کے ردلیف، قافیہ، عروض ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔
اور دیگر اصول پر بھی مکمل عبور حاصل ہے ۔مثال کے طور پر ان کے

ایک بنگالی گیت کے دو بند پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ بنگالی زبان کا یہ آتش نوا شاعر اردو، ہندی، اور فارسی زبانوں پر بھی کس قدر حاوی ہے۔ واضح رہے کہ یہ گیت کوئی ترجمہ نہیں بلکہ بنگالی رسم الخط سے اردو حروف میں منتقل کر دیا گیا ہے ؎

نرگس باگ (باغ) میں بہار کی آگ میں
بھرے دل داگ (داغ) میں کہاں میرے پیارے آؤ آؤ پیارے
درد دل زور رنگیلا کوثر
شراباً طہورا لاؤ ساقی بھر پیالہ تو بھر دے مستانہ کر دے

نشتر و بدر اُن اساتذہ کے علاوہ جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، عبدالکریم نشتر اور بدرالزماں بدر کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں نشتر ایک پُرگو شاعر اور رضا علی وحشت کے تلمیذ ارشد تھے۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "دیوانِ نشتر" تقریباً پندرہ سال قبل شائع ہو چکا ہے۔ ان کا انتقال غالباً ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ موصوف کی پیدائش صوبہ بہار چھپرے میں ہوئی تھی مگر ان کی زندگی و موت کا فیصلہ کلکتہ کے زمین و آسمان نے کیا۔

بدرالزماں بدر بیک وقت خوش فکر شاعر بھی تھے اور بہت اچھے ناول نویس بھی۔ ان کا ایک ناول "احسن" مقبولِ عام و خاص ہے اور بنگال کے ہر کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ شاعری میں علامہ وحشت سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا مولد و مسکن شہر کلکتہ ہے۔ نشتر سے کئی سال قبل انکی وفات ہوئی
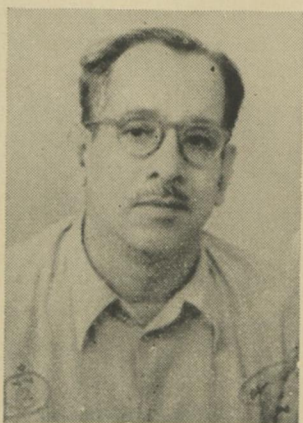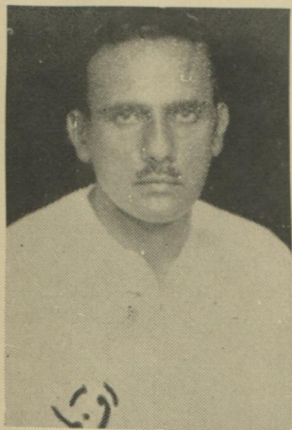
امیر الاسلام شرقی

پیرزادہ ظفر ہاشمی

افسر ماہ پوری
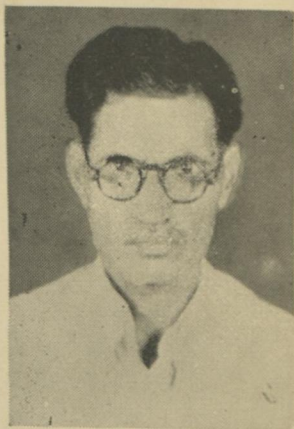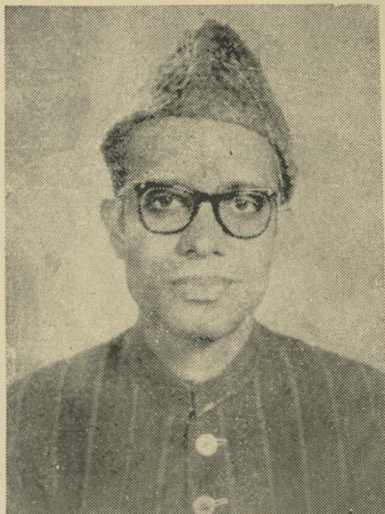
وحید قیصر ندوی
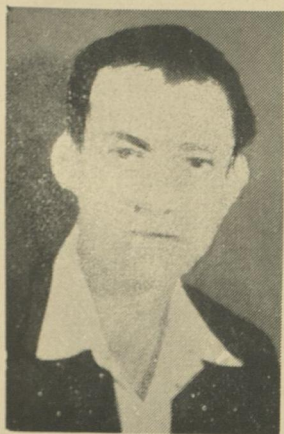
رشید احمد خاں شاد

چوتھا دور

دوسرا گروپ

جمیل نام سیّد کاظم علی کاظمی۔ تخلص جمیلؔ۔ دنیائے ادب میں جمیل مظہری کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۹۰۵ء بمقام عظیم آباد (صوبۂ بہار) پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنے والد ماجد مولانا خورشید حسین کاظمی کے ہمراہ کلکتہ چلے آئے اور ہمیشہ یہیں رہے۔ اعلیٰ تعلیم کی منزلیں کلکتہ میں طے کیں اور کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔

عرصہ تک ان کا تعلق روزنامہ عصر جدید، کلکتہ سے رہا اور اس میں "کوچہ گرد" کے لقب سے "جہملات" کے عنوان پر نکاہید لکھتے رہے۔ جسے کلکتہ کے ارباب ذوق بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کچھ دنوں فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے۔ یہ شیکسپیرِ ہند آغا حشر کاشمیری مرحوم سے ارتباط خاص کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومت بہار کے شعبۂ اردو سے بحیثیت

پبلسٹی آفیسر منسلک رہے۔ اسی دوران میں سیاسی ہنگامے کے موقع پر کچھ دنوں قید فرنگ میں بھی گذارے ہیں۔ رہائی کے بعد پونا حضرت جوش ملیح آبادی سے ملنے گئے اور وہیں کلکتہ کی ایک فلم کمپنی کے جوہر شناس مالک نے اس لعل گرانما کو اپنا لیا۔ سنہ ۴۷ء میں بہار گورنمنٹ نے دوبارہ انہیں ڈپٹی ڈائرکٹر پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے منصب پر فائز کیا لیکن اس عہدے سے بھی مستعفی ہو گئے۔ آجکل پٹنہ یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر ہیں۔

جمیل مظہری سیاست میں آزاد پسند ہیں امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت سے مدت تک فیض حاصل کرنیکا موقع ملا۔

ابتدا میں اپنے والد سے مشورۂ سخن لیتے رہے پھر اسلامیہ کالج کلکتہ کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ وحشت کلکتوی کی طرف رجوع کرنے کا خیال ہوا اور ایک قطعہ کہکر علامہ موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔ جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں ؎

پیچیدہ رسم و راہ سخن دیکھ کر جمیل
مُدّت سے آرزو تھی کوئی راہبر ملے
وحشت بھی ہیں طریقۂ غالب پہ گامزن
یعنی جناب خضر مجھے ہمسفر ملے

علامہ وحشت جوہر قابل دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دو چار غزلوں کی اصلاح کے بعد کلام کو اصلاح سے بے نیاز سمجھ کر یہ رقعہ لکھ دیا :-

"عزیزی! آئندہ سے آپ اپنی طبع سلیم پر اعتبار کریں آپ کے کلام میں وہ بات پائی جاتی ہے جو مشاہیر شعرائے ہندوستان کے کلام

میں نہیں پائی جاتی ۔" تاہم فخریہ خود کو شاگردانِ وحشتؔ میں شمار کرتے ہیں اور اکثر اپنے اشعار میں انتہائی عقیدت کا اظہار فرماتے ہیں ؎

اُسے تتبعِ وحشتؔ کا حق نہیں ہے جمیلؔ
جسے کہ دردِ جگر میں مزا نہیں ملتا

مطرب خلد سے سنی وحشتؔ خستہ کی غزل
آگیا کچھ مزا جمیلؔ زمزمۂ حجاز میں

جمیلؔ مظہری دورِ حاضرہ میں اردو ادب کے اُن ممتاز و مشہور انشاء پرداز اور شاعروں میں سے ایک ہیں جو تمام اصناف پر کامل قدرت رکھتے ہیں اور جن کی نظم و نثر بیک وقت قدیم و جدید رنگ کے حسین و دلکش امتزاج کی حامل ہوتی ہیں۔ جمیلؔ ادب میں نئے رجحانات کے پیدا کرنے کے دلدادہ لیکن اس روش میں سختی سے جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کے پابند ہیں۔ سیاسی، انقلابی، اقتصادی، جذباتی، علمی، ادبی، فلسفیانہ تاریخی، مزاحیہ مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں وغیرہ ان کے قلم سے نکلیں جو ہند و پاکستان کے مشہور اور بلند معیار پرچوں میں چھپتی اور بار بار نقل کی جاتی ہیں۔

جمیلؔ کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے جو انفرادیت کا ضامن ہے۔ لفظوں کا انتخاب، بندش کی چستی، اسلوب بیان کی قدرت، طرزِ تحریر کی جدت و ندرت، زبان کی بیساختگی و شگفتگی وہ خصوصیات ہیں جو جمیلؔ کے موجودہ دور کے اکثر شعراء سے ممیز کرتی ہیں۔ بقول نیاز فتحپوری ــــــ وہ نہایت خوش گو شاعر اور خوش فکر ادیب ہیں اور خیال کی رعنائی اسلوبِ بیان کی گہرائی ان کے ان کا نثر و نظم کی

خصوصیت خاصہ ہے "

جمیلؔ کا ایک مجموعۂ کلام موسوم بہ "نقشِ جمیل" مکتبۂ ادب پٹنہ کے تحت شائع ہو چکا ہے جس کی ضخامت ۲۵۶ صفحات ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی سیاسی، انقلابی، رومانی نظمیں شامل ہیں۔ اس میں سے ایک شعر نقل کرتا ہوں جو ان کی عشقیہ شاعری کے لئے ایک دیباچہ کا حکم رکھتا ہے ؎

شاعری اب دلِ مرحوم کا ماتم ہے جمیلؔ
میرے شعروں کو مبارک مرا نالاں ہونا

بخوفِ طوالت یہاں نمونۂ نظم پیش کرنے سے قاصر ہوں لہذا انکی متعدد غزلوں کے چند اشعار قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے نقل کرتا ہوں ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

یہ کوئی بات نہیں ہے کہ ہوا کے رُخ پر
چھوڑ دوں دل کا سفینہ کہ جہاں تک پہنچے

جمیلؔ اس دل کی بانسری میں ہزاروں نغمے بھرے ہوئے ہیں۔
جسے سنانے کی تھی تمنا اسی نے اینک سنا نہیں ہے

میں شبِ فراق کا خواب خوش ہوں جہانِ ناز و نیاز میں
مری زندگی نے حقیقتوں کو بدل دیا ہے مجاز میں

جو یہی مزاج ہے حسن کا تو کسے ہو عشق کا حوصلہ
نظر آ رہا ہے کسی کا دل مجھے شمع تیرے گداز میں

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

مجھے جلنا نہیں ہے کچھ سمجھ کر دور بیٹھا ہوں
مرا مقصد فقط کسبِ ضیا ہے شمعِ محفل سے

دنیا ہے محبت سے خالی اور دل ہے محبت کا جویا
صحرا میں مسافر پیاسا ہے ملتا نہیں پانی کیا کہیئے

جمیل مظہری کا ایک مسلسل افسانہ فتح و شکست کے نام سے ۱۹۵۰ء
میں مکتبۂ ارتقاء کی طرف سے شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے
اس افسانہ کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ
اس کا پہلا ایڈیشن دو تین ماہ کے اندر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور دوسرا
ایڈیشن اسی سال میں طبع ہوا۔ یہ افسانہ اس سے قبل ۱۹۴۰ء میں ماہنامہ قدیم
پٹنہ کے بہار نمبر میں "فرض کی قربان گاہ پر" کے عنوان سے اشاعت پذیر
ہو کر جمیل کی انفرادی شخصیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ یہ افسانہ ہمارے افسانوی
ادب میں بالکل نئی اور اچھوتی چیز ہے۔ کہانی نہ صرف دلچسپ اور دلکش
ہے بلکہ اندازِ بیان، اسلوبِ گفتار، انشاء پردازی و فلسفہ طرازی میں
کچھ ایسا اچھوتا پن اور بانکپن ہے کہ اس کی مثال اردو نثر میں نہیں
ملتی اس میں فرض و محبت کی کشمکش اور اس کے مختلف مرحلوں میں غیر
شعوری نفسیاتی احساسات و جذبات کی حقیقی ترجمانی کو جس طور پر
قلمبند کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ زبان کی شیرینی اور طرز ادا

کی قدرت سے مطالعہ کے وقت اکثر زبان سے بے ساختہ دادِ تحسین نکلتی ہے۔

آصفؔ عبد الرحمٰن نام۔ آصفؔ تخلص۔ والد کا نام مولوی عبد الشکور بنارس کے محلے چاہ مہاں میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ہنوز ۴ سال کے نہ تھے کہ والدین کے ساتھ کلکتہ آئے۔ شروع ہی سے ذہانت کا یہ عالم تھا کہ بغدادی قاعدہ پڑھتے تھے اور سن سن کر سورتیں اتنی یاد ہوگئیں تھیں کہ قرآن کے متعلم کو غلطی پر ٹوک دیتے تھے اور بتایا کرتے تھے۔ انگریزی میں میٹرک پاس ہیں۔

۱۹۲۰ء حصول فنِ شاعری کے لئے پہلے انسبؔ مرحوم اور اس کے بعد علامہ وحشتؔ کلکتوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے وحشتؔ کے ارشد تلامذہ میں انھیں ممتاز درجہ حاصل ہے بلکہ وحشتؔ کو ان پر ناز ہے۔ آصفؔ کا مقام اب بجائے خود استاد کا ہے حلقۂ تلامذہ بہت وسیع ہے۔ شاگردوں ہندو مسلمان سب ہی ان کے چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ کلکتہ کے مارواڑی ہندو خراد اور دوسرے اردو سے دور افتادہ طبقہ میں اردو سے محبت اور شعر و شاعری کا شوق آصفؔ ہی کے دم سے ابھرا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:۔

پروفیسر اخترؔ۔ ایم۔ اے، اخترؔ پشاوری۔ افضلؔ ایم۔ اے ڈاکٹر شیداؔ دہلوی۔ پردیسیؔ چکوالی، ساغرؔ چینیوٹی، شفقتؔ کلکتوی عطاالرحمٰن عطاؔ، قدوسؔ صدیقی، کلیمؔ جونپوری، لچھمن نرائن، سوتحؔ مدن لال آباد۔ مایالعل دردؔ، سمل جبن چینی، عارفؔ، کاشفؔ، شاکر

ذاکر، رضا ابن آصف، محمد اسمٰعیل فائز، عزم بازید پوری، اختر ماہ پوری، مولانا شفیق اطہر وغیرہ۔

آصف تقسیم بنگال کے بعد ۱۹۵۰ء سے ڈھاکہ (مشرقی بنگال) میں مقیم ہیں۔

کلام نہایت پختہ، اور حسنِ تغزل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ فن و عروض پر کامل مہارت ہونے کی وجہ سے اشعار جس قدر فنی عیوب سے پاک ہیں شاعرانہ اعتبار سے اتنے ہی بلند ہیں۔ نمونۂ کلام:۔

بیچ سے سلسلۂ قصۂ غم توڑ دیا — تیرے عاشق نے جوانی ہی میں دم توڑ دیا
مے بھر تھرائی ساغر مے کانپنے لگی — آنکھیں کھلیں نہ میرے کفِ رعشہ دار کی
اس سادگی کو کہتے ہیں ایمانکی سادگی — کرنے چلے ہیں بت کا گلہ برہمن سے ہم

خودی کے واسطے موزوں نہ بیخودی کے لئے
یہ بندہ ہونا مصیبت ہے آدمی کے لئے

ذوق مرا صحیح تھا شوق کی حد نہ بن سکی
دل کو سکوں نہ مل سکا کعبہ و سومنات میں

جوانی میں پینے سے انکار آصف — یہ کفرانِ نعمت مسلمان ہو کر

عمر بھر گوشۂ مسجد میں ادا کی ہے نماز
پائے ساقی پہ بھی اک سجدۂ شکرانہ سہی

تصادم حسن و الفت کا تو فطرت کا تقاضا تھا
یہ تہمت مفت کی کیسی الٰہی میرے سر آئی

بل ڈالے جاتے ہیں جو یہ بال بال میں
قربان جاؤں کس کو پھنسائے گے جال میں

میکدے میں آگئے ہو، مان لو ساقی کی بات — توبہ کر لیجے تو آصف روکتا کوئی نہیں

واصف

محمد سلیمان نام - واصف تخلص - ۱۹۰۴ء میں بنارس میں ولادت ہوئی - آصف کے چھوٹے بھائی ہیں - والدین کے ہمراہ عہد طفلی ہی میں کلکتہ چلے آئے اور وہیں پروان چڑھے اور تعلیمی منزلیں طے کیں - ۱۹۲۰ء سے نثر نگاری شروع کی - ایک ناول "زنجیر محبت" ۱۶۰ صفحے پر مشتمل لکھا جو طبع ہو کر ۲-۳ سال کے اندر نایاب ہو گیا - "عصر جدید" کلکتہ میں اعزازی طور پر مضامین لکھتے رہے - "افکار پریشاں" کے تحت جتنے بھی مضامین شائع ہوئے واصف ہی کے طبع زاد تھے - یہ مضامین مستقل طور پر ایک زمانہ تک فکاہی کالم میں نکلتے رہے - "کوچہ گرد" کی نقاب ڈال کر علامہ جمیل مظہری عصر جدید کے فکاہی کالم کے لئے مضامین لکھا کرتے تھے لیکن جب موصوف کو یہ نقاب کسی دوسرے کے چہرے پر ڈالنے کی ضرورت ہوتی تھی تو غریب واصف ہی کا چہرہ کچھ موزوں معلوم ہوتا تھا - قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند ---- کاروباری مصروفیت ہمیشہ مضمون نگاری میں سدِ راہ رہی لیکن شائق احمد عثمانی مالک و ایڈیٹر عصر جدید سے تنگ آکر مضامین لکھتے تھے - اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ ایڈیٹر سر پر سوار ہو کر مضامین لکھواتے اور لیجاتے -

مزاحیہ مضامین - افسانے ڈرامے مقالات، غزلیں نظمیں آپ کی قلم کاریوں کا اچھا خاصا نمونہ ہیں - ان کے افکارِ نظم و نثر کی ایک نامکمل سی فہرست درج ذیل ہے :-

مزاحیہ مضامین -

"ہمارا سفر دارجلنگ" عصر جدید کلکتہ میں متعدد قسطوں میں شائع ہوا

بنارس سے بہرائچ " "

کیوپڈ کا مجسمہ اور میں " کے سالنامے "

شکار پارٹی　　خادم کلکتہ خاص نمبر میں شائع ہوا۔

سوراج کے بعد　　"　　"　　"

عہد یا امریکہ　　عصر جدید　　خاص نمبر میں

عجو نواب　　نکات رنگون　　ماہنامہ

چچا نخرو　　ترپیچ لکھنؤ　　سالنامہ بدست نسیم انہونی صاحب

افسانے　　ممثلہ ے عشق　　عالمگیر لاہور

آدم خوار　　"　　"

علمی و تاریخی مضامین :- سیدنا حسین کی قربانی - ہندوستان کی لنگوا فرنیکا اور اس کا رسم الخط جرم و تعدیل - تنقیدات، نیاز فتحپوری پر تنقید۔

تصانیف :- نخچیر محبت یا حسن پاربتی (ناول) پرتھوی راج سپاکستان - جولیس سیزر - جنگ روس و تاتار - شانتا - عورت کا انتقام (فلمی کہانیاں) نادر شاہ (ڈرامہ)

علاوہ بریں غزلیں نظمیں، قطعات اور رباعیات مطبوعہ و غیر مطبوعہ ہیں۔ شرف تلمذ علامہ وحشتؔ سے حاصل ہے۔

نمونۂ کلام پیش ہے ؎

وہ صنم کدہ جو قدیم تھا ہوا کعبہ دین متین کا
وہ حقیقت آئینہ ہو گئی جو نہاں تھی پردۂ راز میں

ہوا جی یک بیک بیزار سب کا پارسائی سے
یہ کیا شئے لا کے تو نے بزم میں پیر مغاں رکھدی

آجاؤ کہ مل بیٹھ کے اک تصفیہ کر لیں
تم عہد جفا کا کرو، ہم عہد وفا کا

ڈالی تھی آرزوئے گلستاں کی داغ بیل
افسردگیٔ دل نے بیاباں بنا دیا

پھر سی رہا ہوں پیرہن تار تار کو | پھر داغ بیل ڈال رہا ہوں بہار کی
کیا نہ کام جو کوہ سے ہو نہ سکا | پہاڑ رات تھی فرصت کی کاٹ دی ہیں نے

قمر نام عبدالصمد۔ تخلص قمر۔ ادبی دنیا میں قمر صدیقی کے نام سے مشہور تھے ۱۹۰۷ء میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے اردو اور عربی کی ابتدائی تعلیم و تربیت والد ماجد کے زیر نگرانی ہوئی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک اور اسلامیہ کالج (حال کلکتہ سنٹرل کالج) سے بی۔اے پاس کیا۔ پھر کلکتہ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ڈبل ایم۔اے کی ڈگریاں امتیازی حیثیت سے حاصل کیں، ایم اے کے ساتھ ساتھ بی ٹی۔ کیا۔

شروع میں لامارٹینیر کالج LA MARTINEER اور دیگر سیشل انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت پروفیسر انگریزوں کو اردو اور فارسی کا درس دیتے رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں پہلے لفٹیننٹ پھر کیپٹن کے عہدے پر فائز رہے۔ تقسیم ہند کے بعد مغربی پاکستان راولپنڈی بھیجے گئے تھے اور پھر مارچ ۱۹۵۰ء میں ان کا تبادلہ مشرقی پاکستان ڈھاکہ ہوگیا جہاں آخری دم تک فوجوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے رہے اور وہیں ۲۱ دسمبر ۱۹۵۱ء کو حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے داعی اجل کو لبیک کہا۔

کیپٹن قمر صدیقی اوائل عمر سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے اسلامیہ کالج کے ایام طالب علمی میں علامہ وحشت کلکتوی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے باکمال نکتہ سنج شفیق استاد کی فیض و شفقت، اپنی اعلیٰ تعلیم، ذاتی مطالعہ خداداد ذہانت اور علمی قابلیت کی بنا پر بہت جلد نکاتِ شعر و ادب اور فن و عروض پر بدرجۂ کمال حاوی ہوگئے

لیکن ہر حال میں وحشت کے دامنِ فیض سے وابستگی کو باعثِ فخر و مسرت محسوس کرتے جب تک بقیدِ حیات رہے اپنے کرمفرما استاد کی جو خدمت، قدر و منزلت کرتے رہے وہ عدیم المثال ہے۔ اپنے کلام میں وحشت کے حسنِ عقیدت و ارادت کا ذکر قمر و مباہات سے اکثر و بیشتر کیا۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

کمالِ نکتہ فہمی سے قمر اپنا یہ دعویٰ ہے
کوئی وحشت کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

اس قسم کے اشعار میں نے شیشے کے فریموں میں بھی لکھے دیکھے ہیں جو ان کے کمروں میں جا بجا آویزاں اور باعثِ زینت ہیں۔

علامہ وحشت قمر کو فرزندِ عزیز کی طرح شفقت فرماتے اکثر موقعوں پر ایسے جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اسلامیہ کالج کے سالانہ مشاعرے میں قمر فوجی ملازمت کے باعث ایک مدت کے بعد شریکِ محفل ہوئے تھے۔ قمر کی شرکت سے وحشت کو جو خوشی ہوئی تھی وہ ضبط نہ کر سکے اور فوری جذبات میں برجستہ یہ شعر ارشاد فرمایا ؎

قمر کے آنے سے محفل کو چار چاند لگے
سخن قمر کے لئے ہے قمر سخن کے لئے

جب قمر کا انتقال ہوا اس وقت خاکسار راقم الحروف لاہور میں مقیم تھا۔ قمر کی وفات حسرت آیات کا پیغام حضرت وحشت نے اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ جن الفاظ میں تحریر فرمایا تھا وہ حسبِ ذیل ہیں ؎

"آپ کو اب تک معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایک جانگداز سانحہ کا مجھ کو بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ قمر صدیقی کی ناگہانی موت ہے۔

دل سے کسی طرح نہ مٹے گا قمر کا داغ   باقی مرے جگر میں رہیگا جگر کا داغ"

قمر صدیقی کلکتہ اور مضافاتِ کلکتہ کی سوسائٹی میں بھی ہردلعزیز تھے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں قمر کی شرکت باعثِ رونق و زینت اور کامیابی سمجھی جاتی ۔ قمر نہ صرف پرگو شاعر تھے بلکہ بدیہہ گوئی و زود کلامی میں بھی اپنا جواب آپ تھے ۔

دورانِ گفتگو میں ان کے دلچسپ و دلآویز چست فقرے بجد لطیف اور اثر انگیز ہوتے ۔ قمر کی شخصیت کا رعب اور کمال شاعری کا اثر بھی محفلوں پر کچھ ایسا چھایا رہتا کہ اچھے اچھوں کا ناطقہ بند ہو جاتا اور ان کی تیز و طرار زبان کے آگے کسی کی ایک نہ چلتی ۔ گذشتہ ربع صدی میں کلکتہ میں جن ارباب ادب کا اردو کی ترقی و اشاعت میں نمایاں حصہ رہا ہے اور جنھوں نے کلکتہ کے نوجوان طبقہ میں علم و ادب کا رجحان پیدا کیا اور ذوق شعر و ادب کی صحیح رہنمائی کی ان کی فہرست میں قمر صدیقی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ خصوصاً جن نوجوانوں کا ذوقِ سخن قمر کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھا ان میں پروفیسر اظہر قادری ایم ۔ اے اور فضلی و آثر قابل ذکر ہیں ۔

قمر صدیقی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن مثلاً نظم ، غزل ، قصیدہ ، رباعی قطعہ ، مسدس ، مخمس وغیرہ پر طبع آزمائی کی لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے ۔ جو حسنِ تغزل اور معیارِ فن کا بہترین نمونہ ہے ۔ فرسودہ خیالات ، نئے اور اچھوتے مضامین ، دلاویز استعارات ، دلنشیں تشبیہات نادر اصطلاحات کے دلدادہ تھے ۔ ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو انھیں اپنے معاصرین میں ممیز کرتی ہیں ۔

مرزا غالب کے رنگ اور وحشت کے تتبع میں بھی اکثر اشعار کہے جو سوز و گداز ، تاثیر ، فلسفۂ محبت اور رموزِ حیات کے حامل ہیں ۔ چند اشعار

ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

مصائب نے جو دنیا میں اس کو آلیا ہوتا
یہ بندہ پھیلتا اتنا کہ عالم کا خدا ہوتا

مجھے محروم جلوہ خود ہوس ہی نے مری رکھا
غبارِ شوق مٹ جاتا تو دل آئینہ سا ہوتا

قمرؔ کب تک ہجوم غم سے محرومی کا افسانہ
مزہ آتا جو کچھ تیری غزل میں فلسفہ ہوتا

یوں محوِ ذوقِ پرستش پر احساں جتایا جاتا ہے
ہوتی ہے نیاز افزائی دل جب ناز اٹھایا جاتا ہے

آتی ہے بہار لالہ رخاں بڑھتی ہے جس کی رعنائی
جب خونِ تمنا سے دل کو رنگین بنایا جاتا ہے

ہر شمعِ تمنا ہے مدہم ہونے کو ہے بزمِ دل برہم
یکساں ہے اب اس کا وجود و عدم کیوں اسکو مٹایا جاتا ہے

افسردگی و الام قمرؔ چھا جائیں نہ اک دن محفل پر
کیوں اس کو بلا کر محفل میں افسردہ بنایا جاتا ہے

قمرؔ صدیقی تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ سلاست و فصاحت کے ساتھ ساتھ روانی، برجستگی، شگفتگی، چستی، بندش اور مناسب الفاظ کی نشست نمایاں خصوصیات ہیں ۔

فضلی نام سید فضل احمد کریم ۔ تخلص فضلیؔ ۔ ولادت نومبر ۱۹۰۶ء وطن ۔ الہ آباد ۔ والد بزرگوار سید فضل رب فضلؔ اپنے عہد کے خوش گو شعراء میں شمار ہوتے تھے ۔ فضلیؔ نے ذوقِ شعری اپنے والد

سے درجہ میں پایا۔ بی۔ اے تک الہ آباد میں تعلیم حاصل کی پھر آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان میں کامیاب ہو کر سنہ ۱۹۲۰ء ٹریننگ کے لئے ولایت تشریف لے گئے وہاں آکسفورڈ سے بی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ نومبر سنہ ۳۲ء میں ہندوستان واپس آئے۔ بنگال میں تقرر ہوا۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک برابر کلکتہ میں رہے تقسیم بنگال کے بعد حکومتِ مشرقی بنگال میں سکریٹری تعلیمات کے منصب پر مامور ہوئے۔ آجکل مری (پنجاب) میں سکریٹری برائے امورِ کشمیر حکومت پاکستان کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔[۱]

فضلی فطری شاعر ہیں بہت خوب کہتے ہیں۔ ایک مجموعۂ کلام "نغمۂ زندگی" جو سنہ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن کے تحت شائع ہوا تھا اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں برابر چھپتے رہتے ہیں۔ ایک غزل پیش ہے ؎

وہی ہے ظلمات کا سا عالم وہی اندھیرا ہے چشمِ تر میں
وہی ہے بعدِ سحر بھی اے دل جو زندگی تھی سحر سے پہلے

اسیر دامِ خرد کے ہیں جو انھیں مبارک یہ احتیاطیں
انھیں سے ہوتے ہیں ضر کے سر جو کھیل جاتے ہیں سر سے پہلے

یہ کیسے مانوں کہ تو نہ کھائیگا اب کوئی پھر فریب اے دل
وہی مری سادگی ہے اب بھی جو تھی فریب نظر سے پہلے

گداز میر اور فکر غالب سے تھی تو ذوق سخن کی لیکن
بھلا کہاں بانکپن تھا ایسا غزل میں فضلی جگر سے پہلے

بیخود ـ عباس علی خاں نام۔ تخلص بیخود۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے سنہ ۱۹۲۶ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک سنہ ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج

---

[۱] آجکل کراچی میں مرکزی حکومت سے وابستہ ہیں۔

سے بی۔اے (اور فارسی آنرز میں اوّل) ۱۹۲۲ء میں فارسی میں درجۂ اوّل میں ایم۔اے اور ۱۹۳۹ء میں اردو میں ایم۔اے کے امتحانات پاس کیے۔

۱۹۳۶ء میں جب علامہ وحشتؔ کلکتوی نے پنشن کے قبل چھٹی لی تو انکی جگہ بیخودؔ کا بحیثیت پروفیسر شعبۂ اردو تقرر ہوا۔ اور ۱۹۴۷ء سے اب تک پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

پروفیسر عباس علیخاں بیخودؔ بقول پروفیسر نیاز احمد (علیگ) پروفیسر اور شاعر دونوں حیثیتوں سے یکساں مشہور ہیں۔ کلکتہ کے ادبی اور تعلیمی ماحول میں انھیں قابل رشک اہمیت حاصل ہے۔ لیکن وہ جتنے مشہور ہیں اس سے کہیں زیادہ ہر دلعزیز ہیں۔"

عباس علیخاں بیخودؔ، پروفیسر بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اگر شاعر اپنے فاتحانہ انداز میں کہتا ہے ؎

موت آ رہی ہے وعدے پہ یا آ رہے ہو تم
کم ہو رہا ہے دردِ دلِ بے قرار کا

تو پروفیسر بھی اپنی بصیرت افروزی کا سکہ بٹھائے بغیر نہیں رہتا ؎

غزل سرائی کی لذت ہے دیرپا بیخودؔ
مگر یہ دور نہیں بادۂ کہن کے لئے

بیخودؔ کا شمار بلاشبہ علامہ وحشتؔ کے اُن شاگردوں میں ہوتا ہے جن پر وحشتؔ کو ناز ہے اور جو ان کی اولاد جیسے عزیز ہیں۔ بیخود کا کلام نہایت پختہ اور زبان و فن کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ ایک مجموعۂ "جامِ بیخودی" کے نام سے ۱۹۴۷ء میں چھپ چکا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ہدیۂ قارئین ہیں ؎

---

[۱] اس کا ایک نسخہ موصوف نے راقم الحروف کو مئی ۱۹۵۴ء میں ازراہِ نوازش عنایت فرمایا تھا۔

جفا کا تیری طالب ہوں وفا ہے مدعا میرا
یقیں نامرادی پر بھی دیکھو حوصلہ میرا

جوشِ جنوں میں تنگ ہیں صحرا کی وسعتیں
وحشی نے تیرے دشت کو زنداں بنا دیا

چمن میں برق ہے گلچیں ہے اور صیاد ہے
قفس میں پھر بھی تڑپتا ہے دل چمن کے لئے

شکرِ خدا کہ شکوۂ اعدا نہیں ہمیں
مرہونِ منتِ کرمِ دوستاں رہے

ہوسِ نشاط و راحت سببِ غم و الم ہے
جیسے سود کا ہو سودا کرے فکر وہ زیاں کی

دلِ حزیں کو اُمید نشاطِ فردا ہے   فریب خوردۂ رنگینیٔ تمنا ہے

سہیں جفائیں جو ہیں لے یہ میری عادت تھی
وفا جو کی نہیں اس نے یہ رسم دنیا ہے

پرویز — نام اکرام حسین تخلص پرویز۔ حلقۂ ارباب ذوق میں پرویز شاہدی کے نام سے مشہور رہیں۔ مولد لودی کٹرہ پٹنہ سٹی۔ میٹرک کلکتہ سے پاس کیا۔ ایم۔ پٹنہ یونیورسٹی سے کیا۔ ۱۹۳۶ء سے اب تک کلکتہ میں مستقل طور پر قیام ہے۔ پہلے دناپور کالج اور اب رپن کالج کلکتہ میں بحیثیت پروفیسر اردو کی خدمت میں مصروف ہیں ماہنامہ جدید اردو کلکتہ بارہ سال تک انہیں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

پرویز شاہدی ایک فطری شاعر ہیں مجسم شاعر اور صرف شاعر، طرزِ انداز گفتگو اور ہر چیز میں شاعرانہ عظمت بدرجۂ کمال نمایاں ہے۔ ان کی آواز اتنی

اچھی اور پڑھنے کا انداز اتنا مؤثر اور دلنشین ہے کہ محفلوں پر چھا جاتے ہیں۔

اختر شیرانی مرحوم کی طرح پہلے خالص رومان، نغمہ و شباب کے شاعر تھے اور اب صرف ترقی پسند شاعر ہیں اور اشتراکی و انقلابی نظمیں کہنے کے دلدادہ۔ حیاتِ انسانی کی تصویر کشی، زندگی کی صحیح عکاسی، خیالات کی بلندی، جذبات کی گہرائی، احساسات کی بے پناہی، زبان کی لطافت، طرزِ بیان کی رنگینی ترتیبِ الفاظ کا حسن، یہ وہ خوبیاں ہیں جو ان کی نظم و نثر دونوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی تخلیقات رنگِ قدیم و جدید کا نہایت حسین و لطیف سنگم نظر آتی ہیں۔ شاعری میں انھیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔

نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی۔ لیکن رباعی ان کا محبوب موضوع سخن ہے اس صنف میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ رباعیاں عموماً ساقی، شراب اور میخانہ کے گرد گھومتی ہیں۔ چند رباعیاں بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

سینے سے زباں تک جلا دے پہلے ساقی دلِ سوزاں کو جگا دے پہلے
شعلہ بنکر رباعیاں لپکیں گی پرویز کو آگ تو پلا دے پہلے

مستی میں نظر جھپک رہی ہے ساقی ساری محفل بہک رہی ہے ساقی
کیا کیف رباعیوں میں بھر لایا ہوں ہر لفظ سے مے چھلک رہی ہے ساقی

افسردہ خوبِ زشت پیتا ہوں میں خونِ حرم و کنشت پیتا ہوں میں
کیا چیز ہے کیا چیز یہ بہتی ہوئی آگ ہر بوند میں اک بہشت پیتا ہوں میں

اب رنگ نہیں رات کا کالا ساقی ہے نور سے پر چاند پیالہ ساقی

تارا بن کر چٹک گئی ہیں بوندیں   ساغر تو نہیں تو نے اُچھالا ساقی

رضا نام سید امیر رضا مظہری الکاظمی۔ تخلص رضا۔ دنیائے ادب میں "رضا مظہری الکاظمی" کے نام سے مشہور ہیں۔ مشہور انشار پرداز و شاعر جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی ہیں۔

رضا مظہری کا آبائی وطن اگرچہ حسن پورہ ضلع سارن (بہار) تھا لیکن ان کی ولادت مئی ۱۹۰۶ء میں ضلع مظفر پور کے ایک دیہات میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مظفر پور میں ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم کے سلسلہ میں مرشدآباد علی گڑھ، کلکتہ، جگہ جگہ کی خاک چھانتے رہے۔ علیگڑھ سے آئی۔ایس۔سی اور بی۔اے کے امتحانات پاس کئے۔ کلکتہ میں بی۔ٹی کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ میں ۱۹۳۷ء میں بحیثیت معلم ان کا تقرر ہوا۔ چند سال حکومت مغربی بنگال کے شعبۂ نشر و اشاعت میں مترجم کی حیثیت سے اردو کی خدمت کرتے رہے اور اب دوبارہ مدرسہ عالیہ میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر عہدۂ علیا پر فائز ہیں ۱۹۵۱ء میں ایم۔اے بھی کر چکے ہیں۔

رضا مظہری ایک پُرگو شاعر اور جلیل القدر انشاء پرداز ہیں۔ بہت کم لکھتے اور بہت کم کہتے ہیں۔ لیکن جو نظمیں، غزلیں، افسانے، مقالات وغیرہ ان کی نوکِ قلم سے نکل کر رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں وہ اُن کی منفرد طرزِ تحریر اور بے پناہ صلاحیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اگر انہیں غم روزگار سے فرصت ملتی تو وہ یقیناً زیادہ لکھتے اور انکی اس کثیر التحریریاں ان کے لئے باعث شہرت بنتی مگر یہ اردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ ایسے فن کاروں کو افکار حیات اور غمہائے روزگار اکثر دنیائے ادب سے دور ہی رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ادب کو ہر حال میں زندگی کے لئے لازم سمجھا۔ سرت چندر چٹرجی کے بہترین

ناول کا ترجمہ 'چوتری' کے نام سے کیا جس کی ضخامت ۵۰۰ صفحات ہے یہ بنگلہ ناول انجمن ترقی اردو کی تغافل شعاری کے باعث اب تک زیورِ اشاعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ دوسرا ناول آوارہ یا بدکار کے نام سے مکمل ہے افسانے مضامین، اور نظموں کے چند مجموعے مرتب اور اشاعت کے منتظر ایک درسی کتاب "نظامِ حکومت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

شاعری کے متعلق خود ان کی زبانی سنیئے۔

"فن شعر میں باقاعدہ شاگردی کا فیض کسی سے بھی حاصل نہ کیا لیکن۔

ع تمتع زہر گوشہ یافتم"

گھر پر والد مرحوم سید خورشید حسن خورشید اور برادر محترم حضرت جمیل مظہری کی صحبتوں میں ابتدائی مشق کی اور اصلاح ہوتی رہی۔ حضرت وحشت اور ان کے شاگردان کرام کے فیضِ صحبت نے بہت کچھ سکھلایا۔ شاعری میرے لئے فنی نہیں، صرف افکارِ زندگی سے گریز کا ذریعہ ہے۔ جو کچھ کہتا ہوں اپنے لئے کہتا ہوں اس لئے میرے شعروں کے دامن میں کوئی پیام نہیں صرف زندگی کے تلخ تجربے ہیں اور یہی میری زندگی پر میرا ایک شعر ایک مجمل تبصرہ ہے[۱]

کسی طرح بھی جو اس ریگ زارِ ہستی پر
اُبھر سکا جو نہ پورا وہ نقشِ پا ہوں میں"

---

[۱] پیامِ نو، مؤلفہ وفا راشدی صفحہ ۱۸۳

کل درد تھا عبارت درماں کی جستجو سے
اب درد بن گیا ہے اک جز زندگی کا

ڈوب کر بھی ہم ابھر آتے ہیں جیسے تقدیر میں ساحل ہی نہیں
دکھ سہے جاؤ جیے جاؤ رضاؔ اس سفر کی کوئی منزل ہی نہیں

گھبرا کے فضائے گلشن سے اکتا کے بہار پیہم سے
آ نکلے گلستاں والے کچھ تقدیر کھلی ویرانے کی

آغاز محبت میں نے کیا محرومی سے مایوسی سے
انجام جو ہے اوروں کیلئے سرخی ہے مری افسانے کی

دریا کے ابل پڑنے پہ رضاؔ حیرت ہو اگر تو زیبا ہے
کیا اس سے چھلکنے کا شکوہ وسعت تھی یہی پیمانے کی

شوق کی سرگرمیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں اگر
زندگی کی آگ میں دل کو سلگتا دیکھئے

دل پر جس کے بھی جو گذر جائے تم نے تو مسکرا کے دیکھ لیا
دل پہ کچھ ابھرے جو تھے نقش امید آنسوؤں کے ساتھ وہ بھی بہہ گئے

جی رہا ہوں پھر بھی میں زندہ نہیں تیرے بغیر
مٹ گیا ہے فرقِ ہستی و عدم میرے لئے

وہ میکش تربیت کرتا نہیں جو ذوق کی اپنے
ابل پڑتی ہے مے اس کی چھلک جاتا ہی جام اس کا

رضاؔ وہ بھول تم سے جو ہوئی تھی اظہار الفت میں
لیا جائیگا شاید زندگی بھر انتقام اس کا

تمنّا منشی مسیح الدین المتخلص بہ تمنّا مرحوم باشندگان کلکتہ میں سے تھے۔ ضیا علی دہشت سے تمنّا کو شرف تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۷۶ھ میں علی پور کچہری کلکتہ میں مختاری کرتے تھے۔ چند اشعار ہدیۂ قارئین ہیں ؎

گر لپٹتا تو کبھی خواب میں اے مصحفِ رو
تنِ عریاں پہ مرے جامۂ عریاں ہونا

جب وہ مہتابی سے رخسار دکھا دیتے ہیں
چرخ پر ماہ کو خورشید بنا دیتے ہیں

حکم قانونِ شفائے مرض غم ہے یہی
بوسۂ لب دلِ بیمار کا درماں ہووے

ذبیح ڈھاکہ کے نواب خاندانوں میں بیشتر خوش فکر اور باکمال شعراء گذرے ہیں۔ عصر حاضر کے شعراء میں شرف الدین شرف (جن کا تذکرہ گروپ اوّل میں ہو چکا ہے) محمد اسمٰعیل ذبیح اور خواجہ عادل قابل ذکر ہیں۔

ذبیح بہت کہنہ مشق شاعر ہیں۔ عمر تقریباً ۷۵ سال کے لگ بھگ ہوگی ظاہر ہے کہ عمر کے لحاظ سے کلام میں پختگی و مشاقی کی جھلک نمایاں ہونی چاہیئے۔ نواب آف ڈھاکہ کے ایڈیکانگ ہیں۔ راقم الحروف کو ان سے کئی بار ملنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

بنگال کے قابل قدر صاحبِ علم و فضل حضرت ابو العلائی سے استفادہ کیا۔ مرزا داغ دہلوی مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت کلام کی اصلاح لیتے رہے۔ داغ کے ہمراہ ہندوستان کے بعض مقامات دہلی۔ دکن اور لکھنؤ کی سیر کی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

روشن فروغ بادہ سے ہے انجمن تمام
ساغر پہ ہو رہا ہے گماں آفتاب کا

کبھی خالی نہیں ہیں چال سے عیار کی باتیں
یہ کہتا ہے دمِ عہد وفا اکثر بہت اچھا
زمانہ بھر میں کوئی غیر کو اچھا نہیں کہتا
کہو انصاف سے کہتے ہو تم کیونکر بہت اچھا

گلہ کیوں کروں کیا مرا سر پھرا ہے | گلے پر عنایت سے خنجر پھرا ہے
بہت دیکھے ہیں انقلابات عالم | فلک عمر بھر میرے سر پر پھرا ہے

عطاالرحمٰن

عطاالرحمٰن صدیقی کلکتہ کے اُن علم دوست اور ادب نواز ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی ساری زندگی خدمتِ زبان اردو اور کاوش و تحقیقات ادب میں گذری ہے۔ ان کے متعدد علمی و ادبی مضامین بنگال کے مختلف رسائل و جرائد مثلاً جدید اردو، روزنامہ ہند، عصر جدید کلکتہ کے عام و خاص ایڈیشن میں چھپ کر اہل علم و اہل نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

سٹر راس مسعود مرحوم نے بھوپال میں فورٹ ولیم کالج کی تقلید میں ایک سوسائٹی قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا مقصد سنسکرت اور ہندی زبان کے علمی ذخیروں اور جواہر ریزوں کو اردو ادب میں منتقل کرنا تھا۔ چنانچہ عطاالرحمٰن نے مسعود مرحوم کے حسب فرمائش ۲۵۰ کتابوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ یہ مسعود مرحوم کو اتنی پسند آئی کہ معاوضہ عطا کیا۔ یہ فہرست عطاالرحمٰن کے علمی ذوق اور وسیع مطالعہ کی شاہد ہے۔ اس فہرست میں کیا کچھ تھا اس کی صراحت خود عطاالرحمٰن کی زبانی سنیئے ——— "یہ فہرست تین حصوں میں منقسم تھی پہلا حصہ اُن کتابوں کا تھا جو براہ راست سنسکرت سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں اور دوسرا حصہ ایسی کتابوں کا تھا جو کسی ایک غیر زبان کے توسط سے اردو میں منتقل ہوئی تھی

اور تیسرا حصہ دوزبانوں وغیرہ کے توسط کا تھا۔"

(سالنامہ جدید اردو ستمبر ۱۹۷۵ء)

ظفر — اہل بنگال کے لئے یہ امر باعث فخر و مسرت ہے کہ "وحشت اسکول" کے چشمۂ فیض سے نہ صرف متوطن بنگال فیضیاب و مستفید ہوئے بلکہ ہند و پاکستان کے اکثر صوبوں کے مشہور و ممتاز اہل قلم کو بھی اس اسکول سے اکتساب فن سخن کا شرف حاصل ہے۔ خصوصاً پنجاب کے جو فنکار دامن فیض وحشت سے وابستہ رہے ان میں پیرزادہ سید ظفر ہاشمی کا نام قابل ستائش و لائق قدر ہے۔

ظفر ہاشمی ایک خوش فکر ادیب اور مشہور شاعر ہیں ان کی متعدد تالیفات و تصنیفات زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر ارباب علم و فضل سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں تقسیم ہند سے پیشتر ہند و پاک کے مشہور اخبارات، رسائل و جرائد، مثلاً روزآنہ انقلاب، مخزن، نیرنگ خیال، عالمگیر لاہور، ساقی دھلی، چمنستان امرتسر وغیرہ میں مضامین نظم و نثر نمایاں طور پر شائع ہوا کرتے اور حلقۂ علم و ادب میں بہ نظر قدر و استحسان دیکھے جاتے۔

گو ظفر ہاشمی کی ولادت بتاریخ یکم جنوری ۱۹۰۹ء میں صوبہ پنجاب بمقام سیالکوٹ میں ہوئی۔ لیکن یہ سعادت فضائے بنگال کو حاصل ہے کہ اس کے زیر سایہ نہ صرف تعلیم و تربیت کی اول و آخر منزلیں طے کیں بلکہ نکات حیات اور رموز سخن سے بھی آشنا ہوئے۔

یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ خان بہادر حضرت علامہ رضا علی وحشت سے ان کی ملاقات صرف ایک بار ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی مگر بذریعہ خط و کتابت استاد شاگرد کے تعلقات اتنے پُر خلوص، پُر جوش اور شفقت و محبت آمیز ہیں کہ اس کی

مثال تاریخ ادب اردو میں خال خال ہے۔ عموماً استاد و شاگرد کے تعلقات اصلاح کلام و مشورۂ سخن تک محدود ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ان میں گفت و شنید اور نامہ و پیام کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس میں خلوص و محبت کم اور تکلفات کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں اس کے برعکس وحشتؔ و ظفرؔ کے خطوط نہ صرف ایک دوسرے کے مخلصانہ جذبات و محسوسات کے شاہد ہیں بلکہ ادب کے لئے سرمایۂ گرانمایہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر مکاتیب وحشتؔ کو کتابی شکل میں شائع کر دیئے جائیں تو ان کی اہمیت مرزا غالبؔ مرحوم کے "اردوئے معلیٰ" سے ہرگز کم نہیں ہوگی

ظفرؔ ہاشمی نے اپنے بے شمار اشعار میں اپنے استاد محترم (وحشتؔ) کی یاد، خوبیٔ کلام اور اعترافِ فیض کا اظہار جس طرز نو اور فخریہ انداز میں کیا ہے۔ وہ ان کی استاد سے والہانہ محبت، بے پناہ عقیدت اور پرستارانہ نیازمندی کا آئینہ دار ہے [۵]

ہاشمی کو سخن پہ ناز تو ہے ملا استاد اُس کو وحشتؔ سا
(حسنِ کلام صفحہ ۸۰)

جو تیری قدر اتنی ہو رہی ہے اہل محفل میں
ظفرؔ کیا حضرتِ وحشتؔ سے پایا ہے بیاں تونے
(حسنِ کلام صفحہ ۱۱۱)

میں نے غزل کہی ظفرؔ وحشتؔ کے رنگ میں (" صہ ۱۱۳)
کچھ انبساطِ خاطرِ دلدار دیکھ کر

صبا کلکتے جا کر حضرت وحشتؔ سے کہہ دینا (صفحہ ۱۱۹)
ظفرؔ پنجاب کے گوشہ میں بیٹھا یاد کرتا ہے

---

[۵] حسنِ کلام ظفرؔ ہاشمی کا ایک مجموعہ کلام ہے۔

ظفر کے دو مجموعۂ کلام "حسنِ کلام اور حسنِ خیال" منظرِ عام پر آچکے ہیں روانیٔ طبیعت اور پُرگوئی کا یہ عالم ہے کہ پانچواں دیوان مکمل ہے ؎

ہاشمی حضرتِ وحشت کا کرم ہے ہم پر
ہاتھ میں پانچواں دیوان لئے بیٹھے ہیں

تیسرا مجموعۂ کلام "تنویرِ عجم" زیرِ طبع ہے جو بہت جلد شائقین علم وادب کے ہاتھوں میں ہوگا۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک ظفر کا قیام لاہور میں رہا۔ ان دنوں امرتسر سے ایک رسالہ "چمنستان" جاری کیا جو حالات کی ناسازگاری کے باعث ۱۹۳۳ء میں بند ہو گیا۔ پھر کچھ عرصہ تک ماہنامہ عالمگیر لاہور کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ ۱۹۳۰ء میں عالمگیر میں ایک مبسوط مقالہ "وحشت کی شاعری" پر شائع کیا اس سے قبل سر عبدالقادر مرحوم کے مخزن میں وحشت کے مقالات اور علامہ اقبال و وحشت کے مطرحی کلام شائع ہوا کرتے تھے مگر حضرت وحشت کا سب سے پہلا مکمل تعارف اسی مقالہ نے کرایا۔ اس مقالہ کے باعث ظفر ہاشمی پر چاروں طرف سے تحسین و آفریں کے پھول برسائے گئے اور علامہ اقبال کی بارگاہ میں ظفر کی رسائی کا سبب یہی مضمون تھا۔ وحشت نے انہیں دنوں یہ شعر ارشاد فرمایا تھا ؎

اگر بنگالہ قدرے من نہ داند ما چہ غم وحشت
صدائے می دہد از گوشۂ پنجاب اقبالم

ظفر کے علمی وادبی مضامین نثر "سیرتِ رسول اور حسنِ ادب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

ظفر ہاشمی کا پہلا مجموعہ حسنِ خیال ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا۔ مجموعی طور پر

یہ کلام صوفیانہ نہ مگر مخصوص رنگ کا حامل ہے۔ ہر نظم ایک خاص رنگ، خاص کیفیت کی آئینہ دار ہے جس کے مطالعہ سے روح میں بالیدگی جذبات میں بیداری طبیعت میں زندگی سی محسوس ہونے لگتی ہے ہر شعر ایک پیام ایک تڑپ اور ایک حیات ہے اقبال اور تعلیماتِ اقبال سے بیحد متاثر ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ اقبال کی صحبتوں اور محبتوں سے فیضیاب ہو چکے ہیں اکثر اشعار اقبال کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں مثلاً ؎

ذرہ ہائے خاک کو دے اذنِ رقصِ بیخودی
آفتاب ان خاک کے ذروں میں پنہاں بھی ہے

دہر میں تیرا ٹھکانہ ہے نہ کعبہ میں پناہ
کفر سے رنجیدہ آزردۂ ایماں بھی ہے

آج جو منزل کی جانب سے چلا ہے رہنما
درحقیقت وہ تو اغارتگرِ ایماں بھی ہے

مندر و مسجد میں ناقوس و اذاں کی ہے پکار
ہر صدا ہے نغمۂ عرفاں فزا سے ہمکنار

بقول حضرت وحشتؔ ظفر ہاشمی کی طبیعت کو شعر و سخن سے ایک قدرتی مناسبت ہے اکثر اشعار سے سوز و گداز مترشح ہے جس سے کلام میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور یہی شعر کی غایت ہے۔

غزلیں عموماً وحشت، حسرت موہانی اور آثر لکھنوی کے رنگ میں کہی

۱ء ۲ء ۵ء ۱۹۵۰ء میں میرا قیام لاہور میں تھا انھیں دنوں جب میں ماہنامہ کائنات ایڈیٹ کرتا تھا ظفر نے مجھے حسن کلام اور حسن خیال کا ایک ایک نسخہ عطا فرمایا تھا۔ (نوٹ صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶)

ہیں جو تغزل کی جان ہیں ۔ الفاظ کی سادگی و پرکاری ، زبان کی برجستگی و پاکیزگی، رنگین تشبیہات، دلکش اصطلاحات، طرزِ بیان کی سنجیدگی و متانت، ظفر کی شاعرانہ رفعت علمی قابلیت اور فنی و ادبی صلاحیت کی مظہر ہیں لطور نمونہ از خروارے حسنِ کلام (دوسرا مجموعہ کلام مطبوعہ ۱۹۳۶ء) سے چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں ؎

تقاضا سوزِ دل کا ہے کہ ہے شوقِ فنا غالب
نہیں معلوم سوئے شمع کیوں پروانہ آتا ہے

جب سے ان کا نقاب اٹھا ہے
لطفِ ذوقِ نظر نہیں آتا

حضرتِ ہاشمی یہ ذوقِ تجسس کب تک
عشق بھی کرتے رہے اور مسلماں بھی رہے

جسے بغیر طلب کے ملا ہو سوزِ جگر
کسی کریم سے وہ التماس کیا جانے

نشاطِ سوز، نگاہِ بلند و ذوقِ یقیں
نہ کر دے مجھ کو حقیقت شناس کیا جانے

مئے یقیں سے ہو لبریز جس کا جام ظفر
بھلا جہاں کا وہ خوف و ہراس کیا جانے

طرزی پورا نام سید محمود طرزی، والد سید محمد علی مرحوم ولد سید قادر علی مرحوم ہے۔ محمود طرزی کی پیدائش ۲۴ ستمبر ۱۸۹۰ء باغپت ضلع میرٹھ میں ہوئی۔

ان کی زندگی کا اولین نصف حصہ پُر از مصائب رہا۔ اس کا ذریعہ معاش سنہ ۱۹۰۶ء سے بحیثیت گارڈ لوائے پانچ روپیہ سے شروع ہوتا ہے،

دس روپیہ ماہانہ پر اسسٹنٹ کوتوال، سولہ روپیہ ماہانہ پر پنشن، ۱۹۱۲ء میں کلکتہ ٹرامویز کمپنی کنڈکٹر رہے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں محمد نذیر خاں دہلوی کے عنایت و کرم سے کاروباری دنیا میں داخل ہوئے اور زندگی کے روشن دن کا آغاز ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں اکاؤنٹنٹ اور ۱۹۲۰ء میں بنو کمرشیل کمپنی کے حصہ دار رہے ۔۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو امریکن ایسٹرن ٹوباکو کارپوریشن لمیٹڈ میں ایک سو پچیس روپیہ ماہنامہ پر ملازم ہوئے ۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۲۱ء میں اس کمپنی کے منتظمین نے دہرمسی میچ کمپنی لمیٹڈ کی تشکیل کی اور سکریٹری کی حیثیت سے سوا چار سو روپیہ تنخواہ سواری کے لئے موٹر کار اور تمام سیاہ سفید کا اقتدار حاصل ہوا۔ اب دو عالیشان پریس کے مالک ہیں ۔ پہلا پریس ۱۹۳۹ء اور دو دسمبر ۱۹۴۵ء میں قائم ہوا۔

محمود طرزی کی شخصیت نہایت بارعب، پُرشکوہ اور ہردلعزیز ہے انقلابی نظمیں اور علمی، تاریخی، ادبی و تحقیقی مضامین اخبارات و رسائل میں چھپ کر ان کی قابلیت و صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں ۔ علم دوستی، بزم پرستی، احباب نوازی اور غربا پروری میں عدیم المثال ہیں۔ فطرتاً حد درجہ خوش مزاج اور بے انتہا بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں ۔ گفتگو میں ایسی چاشنی اور دلکشی ہوتی ہے کہ ہر صحبت اور ہر محفل میں چھا جاتے ہیں ۔ کئی رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر اور سرپرست رہے ہیں ان کا ذاتی کتب خانہ[۱] تقریباً پانچہزار علوم و فنون مشرق و مغرب کے رسائل و کتب پر مشتمل ہے جو ان کے شوق مطالعہ اور ذوقِ علم و ادب کا شاہد ہے

---

[۱] خاکسار راقم الحروف نے انکے کتب خانہ سے بھی استفادہ کیا ہے ۔

آغا حشر کاشمیری مرحوم ان کے رفیق خاص تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ آغا حشر لہ کورنتھن تھیٹر کے لئے ڈرامے لکھتے اور محمود طرزی کے زیر ہدایت وہ اسٹیج ہوتے۔ غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔ نظموں میں عموماً رومانیت کم اور وطنیت کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہے دل بتوں کے لئے اور دماغ فن کے لئے
خطا معاف ہو کیا رہ گیا وطن کے لئے

وہ ملک کیوں نہ خدا داد خودی سے ہو محروم
جہاں ہو روح کی سوداگری بدن کے لئے

سہاگ نام ہے بیوہ کی حسرتوں کا یہاں
کہ چوڑیاں بھی میسر نہیں دلہن کے لئے

بس انتہا ہے کہ ایک بد نصیب بیٹی نے
حیا کو بیچ دیا باپ کے کفن کے لئے

قسم ہے آپ کو مضراب ساز ہستی کی
قلم کو تیغ بنا دیجئے وطن کے لئے

میں خمکدۂ سخن کے ہوں محتسب طرزی
محاسبہ ہے مری نظم اہل فن کے لئے

حسرت پروفیسر عبد القیوم حسرت نعمانی ایم۔اے کلکتہ کے ہر دلعزیز علم دوست اور احباب نواز تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اردو اور سٹی کالج میں فارسی پڑھایا کرتے۔ تقسیم بنگال کے بعد ۱۹۴۹ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ میں اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے تقریباً ۵۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

حسرت نعمانی تنقید و تحقیق کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے مقالات کلکتہ اور لاہور کے رسائل و جرائد میں عموماً اور ماہنامہ نگار (لکھنؤ) (حضرت نیاز فتحپوری حسرت کے بہت مداح ہیں) میں خصوصاً شائع ہو کر ارباب علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جو اردو ادب میں گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ وحشت کلکتوی سے شرف تلمذ رہا۔ نثر کی نسبت نظم کا سرمایہ بہت کم ہے۔ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اسلامیہ کالج کلکتہ کے ایک سالانہ مشاعرہ منعقدہ ۲۰ نومبر ۴۳ء زیر صدارت وحشت میں وہ حسرت نے ایک غزل پڑھی تھی اس کے مندرجہ ذیل تین شعر میرے ذہن میں ابتک محفوظ ہیں۔ مصرعہ طرح تھا ــــ ع

"بہتر یہ ہے کہ حال دل اپنا بیاں نہ ہو"

اے خوگرِ سجود مزاج آستاں کا دیکھ
یہ جذبۂ نیاز ترا رائگاں نہ ہو

دیکھے قفس میں پھر کوئی کیوں خواب گلستاں
جب آنکھوں ہی میں کیفیت گلستاں نہ ہو

کس کس ادا سے اس نے بڑھایا نظر کا ذوق
مطلب یہ تھا کہ کوئی ادا رائگاں نہ ہو

طاہر پروفیسر سیّد محمد طاہر رضوی مرحوم کی پیدائش ۱۹۰۵ء بمقام حسین آباد ضلع پلاموں میں ہوئی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک، ۱۹۲۳ء میں رپن کالج کلکتہ سے آئی۔ اے ۱۹۲۵ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے بی۔ اے (فارسی میں آنرز کے ساتھ) اور ۱۹۲۷ء

ہیں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔اے اور ایم۔اے کے ہردو امتحانات میں اوّل آئے۔

ایم۔اے کے بعد پریسیڈنسی کالج میں لکچرار اور کلکتہ یونیورسٹی کے ہیڈ اگزامنر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کا تبادلہ اسلامیہ کالج میں (جو اب کلکتہ سنٹرل کالج ہے) فارسی کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے ہوگیا۔ تقسیم بنگال کے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء میں راجشاہی کالج (مشرقی بنگال) میں عربک اور پرشین ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کی حیثیت سے تبادلہ ہوگیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب اپنے اہل وعیال سے ملنے کلکتہ آئے تو انھیں دنوں میں اللہ کے پیارے ہوگئے۔

پروفیسر طاہر رضوی کو انگریزی و فارسی میں غیر معمولی لیاقت ومہارت تھی۔ انگریزی میں ایک کتاب "پارسیز دی ہیپل آف دی ملک" تصنیف کی جو اہل علم طبقہ میں عموماً اور پارسیوں میں خصوصاً بیحد مقبول ہوئی۔ ان کی زندگی ہی میں پروفیسر مازندرانی نے فارسی میں اس کا ترجمہ ایران لیگ بمبئی سے کیا اور اردو میں نگار پریس سے شائع ہوا۔

طاہر رضوی ایرانیات و اسلامیات کے مضامین میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ دوسری تصانیف خدمات ایران بہ اسلام دیگانگت آیات قرآن وگاتھا اور یکسانی عقائد دکیش زردشتی ہیں۔ ان تصانیف کی شہرت کے باعث ۱۹۳۴ء میں سابق شاہ ایران رضا شاہ پہلوی مرحوم نے ایران کے مشہور ومعروف شاعر فردوسی طوسی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب میں خاص طور سے مدعو فرمایا تھا۔ تقریب کے موقعہ پر طہران میں اپنی فارسی میں فاضلانہ تقریر کے ذریعہ اپنی ہندوستانی تحقیقات علمی کا ثبوت پیش کیا

اور یہ ثابت کیا کہ شاہنامہ میں جو اشعار فردوسی نے دقیقی کے نام سے لکھے ہیں
وہ حقیقتاً فردوسی ہی کے ہیں۔ اسی زمانے میں بغداد و عراق کا بھی سفر کیا۔

اردو زبان میں تقریباً چالیس کتابیں اسکول و کالج کے تعلیمی نصاب
کے لئے لکھیں جن میں سے بعض کی فہرست یہ ہے۔

(۱) گلشنِ اردو (۲) خیابانِ ادب (۳) دبستانِ رضویہ
(۴) انتخاب سبزواریہ (۵) چمنستانِ ادب (۶) اردو کمپوزیشن

وحید وحید النبی خاں۔ المتخلص بہ وحید ایم۔اے۔ کلکتہ کے قادر الکلام
شاعر، جلیل القدر ادیب اور شہرۂ آفاق مصنف تھے۔

زندگی کی اول و آخر سانس کلکتہ میں لی اور ۱۹۴۲ء میں اس دارِ فانی
سے عالمِ جاودانی کو سدھارے۔

کلکتہ یونیورسٹی سے اردو، فارسی، انگریزی میں ٹرپل ایم۔اے کیا۔ گو
اپنی خوددار طبیعت کے باعث شہرت اور نام و نمود سے اجتناب کرتے رہے
لیکن اردو زبان و ادب کی جو خاموش خدمات انجام دی ہیں وہ رہتی دنیا تک
فراموش نہیں کی جاسکتیں، انگریزی، فارسی، عربی اور اردو ادبیات سے متعلق
وسیع مطالعہ اور غیر معمولی تحقیقات تھیں۔ تحریر و تقریر میں بے تکلفانہ بحث
و مباحثہ کی صلاحیت رکھتے تھے۔

انگریزی زبان میں میٹرک کلاس کے لئے کئی کتابیں تالیف و تصنیف
کیں جن میں انگریزی و اردو قواعد کی ایک کتاب "ٹینس ٹیچر" — "TENSE
TEACHER" بیحد مفید و مقبول ہے اور بیس سال سے داخلِ نصاب ہے۔

ادبی تصانیف میں ایک ڈرامہ "خیر و شر" آج تک کتب خانوں کی زینت
ہے۔ اس کا ایک نسخہ خاکسار مؤلف کے کتبخانہ میں محفوظ ہے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشی بورڈ آف اگزامنر اور مدرسہ عالیہ کے مدرس تھے۔ ظاہر ہے کہ سیکڑوں طلباء ان کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہو چکے ہیں۔ مؤلف کو بھی موصوف سے اکتساب علم کا فخر حاصل ہے۔

وحید فطری شاعر تھے۔ علامہ وحشتؔ کلکتوی کے خوشہ چیں اور عزیز خاص تھے۔ اور انھیں سے کسب فن شاعری کی سعادت حاصل کی۔ موزونیٔ طبع و حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ جماعت میں انگریزی نظمیں پڑھاتے وقت اکثر اشعار کا اردو ترجمہ کر ڈالتے۔ راقم الحروف کی درخواست پر (ورڈز ورتھ) (WORDSWORTH) کی مشہور رومانی نظم "LUCY" (لوسی) کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ ترجمہ کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ خاکسار انگریزی شعر پڑھتا جاتا اور اس کا ترجمہ وہ اردو شعر میں فرماتے جاتے اور پھر خاکسار قلمبند کرتا جاتا۔ افسوس کہ وہ نظم ضائع ہو گئی۔

"جنگ اُحد" اور "جنگِ بدر" سے متعلق ان کی نظمیں جو مسدس کی شکل میں ہیں اردو شعری ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بخوفِ طوالت نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

ایک نظم "اردو" سے متعلق جو مدرسہ عالیہ میگزین ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے چند اشعار قارئین کے تفنن طبع کے لئے پیش کرتا ہوں۔

ہے موجد زبان اُردو فضائے فطرت

روح و روان اردو نشو نمائے فطرت

سچ تو یہ ہے کہ اس کے بانی ہیں دو ہی ارکاں

اک رکن اس کے ہندی اک رکن اہل ایراں

ہندوستاں زمیں ہے، فارس نے بیج ڈالا

دونوں نے مل کے بویا۔ دونوں نے مل کے پالا

مغلان پارسی گو ہندوستان میں آئے

رنگ اپنے ہندیوں پر ہر بات میں جمائے

وہ لفظ ان سے سیکھے اور دس انھیں سکھائے

اپنی معاشرت کے آداب بھی بتائے

یوں رفتہ رفتہ بھاشا میں فارسی سمائی

یعنی زبان اردو یوں کام میں آئی

ثا، صاد، عین، طا، ظا گو ہیں عرب سے آئے

مانوس ہند ہو کر ہندی میں ہیں سمائے

کیوں ہے نزاعِ لفظی کس واسطے لڑائی

کہتے ہیں جس کو ہندی اردو وہی ہے بھائی

دونوں میں فرق کچھ بھی دیتا نہیں دکھائی

کچھ فرق ہے تو یہ کہ اردو میں ہے صفائی

گسہ زبان ہندی، غصہ زبان اردو

مہراج طرز ہندی حضرت بیان اُردو

کوچوں میں ہے یہ ہندی بازار میں ہے اردو

قصبوں میں ہے یہ ہندی دربار میں ہے اُردو

بولی میں ہے یہ ہندی اشعار میں ہے اردو

پنچوں میں ہے یہ ہندی محفل میں یار اُردو

ہندی زبان اردو محتاج زیب و زینت

اردو زبان ہندی بے دھج میں خوبصورت

کہتا ہے کوئی اردو اسلام کی زباں ہے
کہتا ہے کوئی اس میں ہندو دھرم نہاں ہے
کہتا ہے کوئی اس میں عیسیٰ کی داستاں ہے
کہتا ہے کوئی اس میں زرتشت کا بیاں ہے
باتیں اگر یہ سچ ہیں شکرِ خدائے برتر
حسن قبول اردو نے پالیا ہے گھر گھر
قضیہ اسی زباں میں اظہار اسی زباں میں
بازار اسی زباں میں بیوپار اسی زباں میں
تقریر اسی زباں میں گفتار اسی زباں میں
مذہب اسی زباں میں سنسار اسی زباں میں
ہندوستان میں کہئے اردو کہاں نہیں ہے؟
اس پر یہ ضد کہ اردو ہندی زباں نہیں ہے

امیر

نام امیر الاسلام، تخلص امیر، حلقۂ ادب میں "امیر شرقی" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ والد کا نام آنریبل خان بہادر معین الاسلام انسپکٹر جنرل رجسٹریشن متحدہ بنگال اور ممبر کانسل آف اسٹیٹ متحدہ ہند۔

امیر شرقی کا سن پیدائش ۱۹۰۲ء بمقام کلکتہ ہے۔ مدرسہ عالیہ سے میٹرک، ہسٹینگز ہاؤس اسکول علی پور سینیئر کیمبرج، پریسیڈنسی کالج سے بی۔اے اور ۱۹۲۷ء میں علم ریاضی میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ اوّل الذکر تین امتحانات میں امتیازی نمبروں کے ساتھ آنرز کیا اور آخرالذکر ایم۔اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔

بنگالی ان کی آبائی زبان ہونے کے باوجود، اردو، فارسی، عربی،

سنسکرت، لاطینی، فرانسیسی زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا زیادہ حصہ اردو کلام پر مشتمل ہے لیکن فارسی، بنگالی، عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اردو شاعری میں شرف تلمذ علامہ وحشت کلکتوی سے ہے۔ ناطق لکھنوی مرحوم سے بھی کسب فن کیا۔ ہر صنف سخن میں فکر کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ گوئی ان کا محبوب مشغلہ ہے اور اس فن میں قابل رشک حد تک کمال رکھتے ہیں۔ شادی، موت، ملاقات، گفتگو، گویا چلتے پھرتے بیٹھتے اٹھتے ہر موقع ہر لمحہ پر مبالغہ تاریخ تاریخ کہہ ڈالی۔ ان کے لئے معمولی سی بات ہے لطف یہ کہ مصرعہ یا شعر میں کبھی ناہمواری، ناموزونیت یا ابہام نہیں پایا جاتا ہے بلکہ جو مصرعہ ہے ڈھلا ہوا جو شعر ہے فنِ تاریخ گوئی کا اعلیٰ نمونہ ذیل میں تاریخ گوئی کے چند نمونے ہدیہ ناظرین ہیں ؎

۱۔ صنعت نہ خانہ طبعزاد

سنہ ۱۹۴۷ء

خواب اقبالؒ	سراجِ دینِ اسلام	تعمیرِ جناحؒ
فتح آسمانی	طلوعِ پاکستان	رحمت
آفتابِ دائمؒ	رفیق اہلبیت	تحفۂ نبیؐ

اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں یا الٹا یا ترچھا۔ ایک ہی قطار کے تین خانوں کے الفاظ کے اعداد بحساب جمل (ابجد) جوڑیئے تو سنہ ۱۹۴۷ء ہونگے جو طلوعِ پاکستان کا سال ہے۔

(۲) ذیل کی نعتیہ تاریخ میں حضور صلعم کی ولادت، نبوت، معراج شریف ہجرت اور رحلت کی عیسوی تاریخیں ہیں - ایک حرف بھی زائد نہیں سلام و درود بھی ہیں -

نزول عشق ابد	اے بہ سلام و درود	(ولادت)
۵۷۰ ء	۵۷۰ ء	
جمیع زیب نبوت	اطاعت المحمود	(نبوت)
۶۱۰ ء	۶۱۰ ء	
قعود منزل معراج	ہجرت طٰہٰ	(معراج شریف اور ہجرت)
۶۲۱ ء	۶۲۲ ء	

ماکی و حاصل مقصود، واصل موجود (رحلت)

۶۳۲ ء

(۳) قطعہ تاریخ متعلق پیامِ نو مؤلفہ وفا راشدی

راشدی نے جانفشانی سے انھیں یکجا کیا
انقلابی اور قومی خاص نظمیں بے نظیر
مرأتِ حیرت، پیام نو، وفا مشہور خلق
۱۳۶۸ھ ۱۳۶۸ھ
دو ہری تاریخ ہجری خوب لکھی اے امیر

(۴) تاریخ رحلت قائد اعظم

رو د بابائے پاکستان جناح قائدِ اعظم

۱۹۴۸ ء

(۵) تاریخ رحلت اختر شیرانی

گوہر فردوس اختر حق پناہ
۱۳۶۷ھ
۱۹۴۸ء

(۶) تاریخہائے شہادت امام حسینؑ۔

حق شہید کربلا	نماز عاشورہ	سلام آقا شہید حسینؑ
۶۶۸۰	۶۶۸۰	۶۶۸۰

(۷) تاریخ وصال اکبر الہ آبادی   داد جان، جانِ ظرافت اکبر

۶۱۹۵۱

(۸) تاریخ شہادت قائد ملت لیاقت علی خاںؒ

کیا شہادت قائدِ ملت کی ہے

۱۳۷۱ھ

گنج حلم آں قائد ملت لیاقت شد شہید

۱۹۵۱ء

امیر شرقی کا ذاتی کتب خانہ ہر علم و فن مثلاً موسیقی، ادب، تاریخ، فلسفہ، فقہ، شاعری، وغیرہ کی لاتعداد کتابوں پر مشتمل ہے جو ان کے ذوقِ سلیم اور مذاقِ علم کا آئینہ دار ہے۔

فنِ پر مہارت ہے۔ موسیقی کے متعلق متعدد معلومات افزا و مفید مضامین بنگالی رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، بنگال کے کئی مشہور موسیقی انجمن کے سرپرست، صدر اور سکریٹری رہے۔ اس فن کے کئی رسائل ایڈیٹ بھی کر چکے ہیں۔

آجکل تاریخ اور عروض و فن شاعری پر ایک کتاب کی تالیف و تحقیق میں معروف ہیں۔

اختر پروفیسر اختر حسین۔ اختر ۱۴ ر نومبر سنہ ۱۹۰۱ء بمقام کلکتہ پیدا ہوئے سنہ ۱۹۰۵ء میں پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بہرۂ عربی سے

عربی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۸ء میں بہرہ انگریزی سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں عربی میں ایم اے اور ۱۹۲۷ء میں بی۔ ایل کے امتحانات پاس کئے۔ حافظِ قرآن بھی ہیں۔ پریسیڈنسی کالج ہوگلی کالج، لیڈی برابارن کالج میں لکچرار رہنے کے بعد ۱۹۳۱ء سے اسلامیہ کالج (حالیہ کلکتہ سنٹرل کالج) میں بحیثیت پروفیسر عربی اور فارسی کے انچارج ہیں۔

شاعری میں عبدالرحمٰن آصف تلمیذ رشید علامہ وحشت کلکتوی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۱۹۴۵ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے سفر کے تاثرات "سفرنامہ" کی شکل میں قلمبند کئے جو حلقۂ ارباب ذوق میں بیحد پسند کئے گئے ان کی کئی درسی کتابیں جغرافیہ اور تاریخ کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔

چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش ہیں ؎

زیب دیتے ہیں رخِ روشن پہ گیسوئے سیاہ
ہیں ترے قربان کتنی صبح پر ور شام ہے

آخر سما سکی نہ حقیقت مجاز میں
اس کو لباس تنگ نے عریاں بنا دیا

یہ پیکرِ ضعیف یہ بارِ گرانِ غم
اس پر بھی ناز ہے ہمیں انساں بنا دیا

اصل اصول زیست عبادت سہی مگر
انسانیت ضرور رہے انسان کے لئے

اخترؔ نہ چھوڑ اس صنمِ حق نما سے ربط
کچھ کفر بھی ضرور رہے ایمان کے لئے

عبدالرحیم

پروفیسر عبدالرحیم شاعر نہیں بلکہ اردو اور انگریزی کے نہایت سلجھے ہوئے ادیب ہیں۔ عمر کوئی پچاس پچپن سال

کی ہوگی۔

۱۹۱۲ء میں علیگڑھ یونیورسٹی سے عربی میں ۱۹۱۴ء ڈھاکہ یونیورسٹی سے اقتصادیات، بی، ایم اے کی سندیں حاصل کیں ۱۹۱۱ء میں علیگڑھ کے ریسرچ اسکولر" اسلامی اقتصادیات بھی رہے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۰ء تک پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں عربی، فارسی، اردو کے لکچرار اور انگریزی کے ممتحن رہے۔

سیاست سے بھی وابستگی رہی۔ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر "کامریڈ" ایڈیٹ کیا۔

دورِ حاضرہ کی اشتراکیت وجمہوریت کی روشنی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں "سیرتِ رسول" اور کربلائے معلی یا واقعاتِ کربلا" قابل ذکر ہیں۔

شاکر نام طاہر علی۔ تخلص شاکر۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ کلکتہ کے جوان فکر شاعر ہیں۔ فن اور زبان پر کافی مہارت ہے۔ کلکتہ میں ماہنامہ شمس اور "بزم شاکری" کے ذریعہ اردو زبان کی جو بے لوث وخاموش خدمت انجام دے رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہے۔ کلکتہ کے بے شمار نوجوانوں نے انکی رہنمائی سے ذوقِ سلیم پایا۔ اور مذاقِ شاعرانہ سے آراستہ ہوئے۔

غزل ان کا خاص موضوع سخن ہے اس صنف میں خوب کہتے ہیں۔ زباں کی سلاست اور کلام کی فصاحت قابل ستائش ہیں۔ وحشت اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالب اور وحشت کے کلام سے بے حد متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وحشت وغالب کا رنگِ خصوصی غالب ہے۔ اکمل مرحوم سے بھی استفادہ کیا۔ اگر شاکر طبیعت کے قانع نہ ہوتے اور شہرت سے اجتناب نہ کرتے تو بلاشبہ اپنی انفرادی خوبیوں اور قادر الکلامی

کے باعث ملک کے ممتاز الشعراء میں شمار کئے جاتے۔ وحشت کی مختصر رائے شاکر کے لئے آخری سند کا حکم رکھتی ہے کہ۔ "شاکر نہایت باکمال شاعر ہیں۔" نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دل کی بربادی کا پھر مجھ کو یقین ہونے لگا
پھر ہجوم شوق حسرت آفریں ہونے لگا
اس قدر بھی خود نمائی کی ہوس اچھی نہیں
سنتے ہیں وہ جلوہ گر اب ہر کہیں ہونے لگا
تابکے سنتا رہے آخر کسی کا غم کوئی
مجھ سے آزردہ مرا ہر ہمنشیں ہونے لگا
میرے چہرے پر لکھا ہے جیسے حرف آرزو
اس نے دیکھا مجھ کو اور چیں بر جبیں ہونے لگا
اس سے شاکر اب شکایت کا کوئی پہلو نہیں
اس کا ہر انداز اب تو دلنشیں ہونے لگا

اختر نام ایم۔ وائی۔ اختر۔ عمر تقریباً ۳۸ سال۔ تیرہ چودہ سال کی عمر سے انھوں نے شاعری شروع کی۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا۔ اسلامیہ کالج کے مشاعرے میں دو ایک بار شرکت بھی فرمائی ان کی غزلیں زیادہ تر مدینہ بجنور، نیرنگ خیال، عالمگیر لاہور اور دیگر پرچوں میں شائع ہوئیں۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے نظمیں لکھیں اور افسانے بھی لکھے، ان کے افسانے "ثانی" کے نام سے عالمگیر لاہور اور جدید اردو کلکتہ میں اکثر شائع ہوتے تھے۔ حالات کی الجھنوں کے باعث آجکل بہت دنوں سے خاموش ہیں۔ پیدائش۔ کلکتہ میں ہوئی اور اب تک وہیں ہیں؛

مختار | نام حافظ نظیر الحق۔ تخلص مختار۔ عمر تہتر[۳] سال سن ولادت ۱۲۹۹ھ مقام ولادت حاجی پور ضلع مظفر پور بہار۔ سترہ سال کی عمر سے ابتک کلکتہ میں اقامت پذیر ہیں۔ گلستاں، بوستاں، واقعات عالمگیری و بہار دانش اور اردو و فارسی کی دیگر درسی کتاب اپنے والد بزرگوار شیخ مولوی جلال الدین مرحوم سے پڑھیں۔

نظم و نثر میں عروض نویسی کے ماہر ہیں۔ آفروز جو مشہور فارسی گو شاعر تھے اور شاد عظیم آبادی کے ہمعصروں میں سے تھے، سے فارسی و اردو کلام کی اصلاح لیں۔ اب بجائے خود استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ علامہ خضر پور کلکتہ کے بیشتر تعلیم یافتہ و صاحب ذوق مختار کے ذوق سخن سے استفادہ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ایک غزل کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

آگیا یہ کہاں کا ہوش آتے ہی کوئے یار میں
گرمی لگا رہا ہوں میں دامن تار تار میں

تجھ کو چمن سے کام کیا آگ لگا بہار میں
کھیل اے جنونِ ہجر یار وادی کوہسار میں

ایک برہنگی مری پوشش بہت کی ہو گئی
میری قبا کے تار تار بٹ گئے خار خار میں

ٹانکے شگافِ زخم کے ٹوٹے جو میں کمے آہ کی
چارہ گر دمیں کیا کروں دل بھی ہو اختیار میں

مختار خوبی صدتے ہے شعر شعر پہ
طول بیاں ہے مختصر حس ہے اختصار میں

اسلم

نام حافظ محمد حنیف - تخلص اسلمؔ - عمر تقریباً ساٹھ سال - شاگرد وحشتؔ - صوم و صلوٰۃ کے پابند - نعتیہ کلام ان کا سرمایۂ شاعری ہے - کلکتہ میں پیدا ہوئے - ایک نعت کے چند اشعار سنیئے ؎

کیا رکھیں کام لالہ و سرو و چمن سے ہم
گلہائے نعت چنتے ہیں باغِ سخن سے ہم

یثرب کی بزم جو ہے وہ ہے بزم جانفزا
غمگیں کبھی بھی آئے نہ اس انجمن سے ہم

ذکر نبیؐ بجائے انا الحق زباں پہ ہے
مایوس ہیں فسانۂ دار و رسن سے ہم

زنار میرے ہاتھ میں تسبیح بن گیا
اب کیا تقاضا اور کریں برہمن سے ہم

روح الامیں بھی مست ہیں جن کی شمیم سے
لاتے ہیں ایسے پھول عرب کے چمن سے ہم

مست و انجم

غلام محمد مستؔ بڑے کہنہ مشق شاعر تھے - غالباً ساٹھ سال کی عمر میں آج سے آٹھ دس سال قبل انتقال فرمایا - مستؔ کی طرح غلام رسول انجمؔ بھی ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور کثیر التلامذہ - آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد تھے - انھوں نے کوئی بچاس سال کی عمر میں سنہ ۱۹۴۹ء میں رحلت فرمائی -

مستؔ اور انجمؔ اب ہم میں نہیں رہے - لیکن انھوں نے اردو زبان کی جو بے لوث خدمت کی ہے وہ فراموش نہیں کی جا سکتیں ان کے گیت، غزل اور قوالی نہ صرف ریکارڈنگ کے لئے مقبولِ خاص

وعام تھی بلکہ عام مجلسوں اور محفلوں میں بھی ان کا کلام بڑے وجد آفریں انداز میں پڑھا اور سنا جاتا رہا ہے - ان کے اشعار آج بھی بنگال کی گلیوں میں اکثر جوان اور بچے گاتے اور گنگناتے نظر آتے ہیں - ہندوستان کے مشہور ترین قوال پیارو اور کالو، کلکتہ والے نے مستؔ و انجمؔ کے کلام کی بدولت ہندوستان گیر شہرت حاصل کی - کلام مستؔ ۔

اے خوشی کے دیکھنے والے یہ غم بھی دیکھنا
مٹیں گے ایکدن الفت میں ہم بھی دیکھنا

اے کتابِ دلربائی پڑھنے والے رات دن
ہے کہیں اس میں لکھا لفظ کرم بھی دیکھنا

مستؔ وہ جاتے ہیں منہ پھیر کر جانے بھی دو
زندگی سے یونہی منہ پھیرینگے ہم بھی دیکھنا

قوالی

پری جمال، پری وش، پری ادا، ساقی
ترے حجاب کے صدقے نقاب اٹھا ساقی

جلائے دیتی ہے مستی بھری ادا ساقی
کرم، کرم کہ پھنکا مستؔ مبتلا ساقی

مے سے آتی ہے خوشبو گلاب کی
ساقیا بھر دے بوتل شراب کی

کلام انجمؔ :-

ہندی غزل کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں -

شبرب کے دو لھا سے لاگی لگنوا
جا سے اجیارا ہے چودہ بھنوا

مٹی کے بھبوت میں نے جوگ اپنائی
بھول گئی تن تن کی جتنوا

عادل خواجہ محمد عادل جہانگیر نگری ڈھاکہ کے نواب خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل پاکستان اور نواب آف ڈھاکہ خواجہ حبیب اللہ خاں کے برادر عزیز ہیں۔ ڈھاکہ ان کا وطن و مسکن ہے۔ وہاں کے شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ عمر تقریباً پچاس سال ہوگی۔ ایک غزل کے چند اشعار آپ کی ضیافت طبع کے لئے پیش ہیں ؎

خوں گشتہ ہیں دل اور جگر، کچھ نہ پوچھئے
کس کی نگاہ کا ہے اثر، کچھ نہ پوچھئے

بیگانہ وار گذرے وہ، یہ بھی فریب تھا
پوشیدہ التفات نظر، کچھ نہ پوچھئے

سب کی نظر بچا کے وہ چشم حیا پرست
ایک بار اٹھ گئی جو ادھر کچھ نہ پوچھئے

عادل نے ایک بار نہیں بلکہ بار بار
کھایا ہے کیا فریب نظر کچھ نہ پوچھئے

احمد محی الدین محمود نام احمد تخلص، مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے اردو شاعر غالب بنگال کے عزیز قریب اور تلمیذ رشید ہیں۔ ولادت بولائی نامی ایک گاؤں جو ضلع میمن سنگھ مشرقی پاکستان میں ہے، ہوئی۔ اردو فارسی اور عربی کی تعلیم مولانا عبدالعزیز مرحوم اعظم گڈھی سے اپنے گاؤں میں حاصل کی۔

محمود بنگالی متخلص بہ احمد ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں کے سو فی صدی باشندے بنگلہ بولتے ہیں اور اردو سے کسی کو دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن ایسے ماحول میں ایک احمد کی اردو زبان اور شعر و ادب سے اتنی گہری دلچسپی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ احمد کے کلام میں وہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں

جو ایک باکمال شاعر میں ہونی چاہئیں۔ ان کا ایک دیوان مکمل ہے جو منتظرِ اشاعت ہے۔ ایک نظم "تاج محل" کے چند بند ملاحظہ فرمائیے ؎

اے تاج اے سیماب تن اے گوہرِ انجم وقار
ہے گنبدِ گردوں ترے گنبد کے آگے شرمسار
صدقہ ہیں تیرے مہر و مہ ہے چاندنی تجھ پر نثار
ہیں بوسۂ پا کیلئے جمنا کی موجیں بے قرار

ہیں زینتِ محراب وہ نقش حسین تحریر کے
ہوں مصحفِ رخسار پر جس طرح خط کے حاشیے
یہ پھول ہیں حرفوں کے یا رنگین جواہر ہیں جڑے
یا چشمۂ کافور میں کالے ہیں۔ لہرائے ہوئے

جمنا تری تنویر سے کوسوں تلک پر نور ہے
گویا لبِ ساحل کوئی روشن چراغِ طور ہے
یا گھاٹ پر اشنان کو آئی ہوئی اک حور ہے
سبزہ پہ رکھا ہوا اک ساغرِ بلور ہے

محفوظ الحق

خان بہادر پروفیسر محمد محفوظ الحق ایم۔ اے کی تاریخ پیدائش ۷ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء بمقام سداللہ پور ضلع پٹنہ صوبہ بہار اور تاریخ وفات ۱۰ رجون سنہ ۱۹۴۷ء بمقام کلکتہ ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک سنہ ۲۰ء میں پریذیڈنسی کالج سے بی۔ اے سنہ ۲۲ء میں فارسی میں

کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کے امتحانات پاس کئے۔ ایم۔اے درجۂ اوّل میں کیا
۱۹۲۳ء میں رپن کالج اور اس کے بعد پریسی ڈنسی کالج میں فارسی
کے پروفیسر رہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ جات عربی، فارسی، اسلامی تاریخ
و تمدن سے بھی وابستہ رہے۔

پروفیسر محفوظ الحق فارسی زبان و ادب کے جید عالم تھے۔ انھوں نے
سب سے پہلے شہزادہ داراشکوہ کی مشہور فارسی تصنیف "مجمع البحارین"
کو جدید و آسان فارسی میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کیا۔ اس کتاب میں
ہندوستان کے دو بڑے ہندو مسلم مذاہب کا عجیب دلکش انداز میں
موازنہ ہے۔ اس کتاب کا تعارف ۱۹۲۹ء میں انگریزی کے مشہور جریدہ
BIBLIOTHECA INDICA SERIES شائع ہوا تھا۔ شہنشاہ
بابر کے فرزند ارجمند مرزا کامران کے فارسی دیوان کو اردو لباس سے آراستہ کیا۔
اس میں ان کا ایک قابل قدر مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ
کے زیر اہتمام زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی تھی۔ اس مقدمہ
کا خلاصہ انگریزی زبان میں بھی اشاعت پذیر ہوا اس کی وجہ مقدمہ کی مقبولیت
تھی۔

مسٹر ایچ۔اے۔ ہارلے (MR: H.A. HARLEY) پرنسپل اسلامیہ
کالج کلکتہ اور پروفیسر عبدالمقتدر کی باہمی مدد سے امین احمد رضی کی تاریخی و
جغرافیائی انسکلوپیڈیا کی پہلی جلد کو انگریزی زبان میں منتقل کیا جو "ہفت قلم"
یعنی (THE SEVEN CLUMIES) کے نام سے انگریزی صحیفہ
(BIBLIOTHECA INDICA SERIES) میں ۱۹۳۹ء
میں چھپی۔

"رباعیات عمر خیام" کا نہایت دلکش ترجمہ کیا جو ۱۹۴۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

متعدد کتابوں کی تالیف و تصنیف کے علاوہ محفوظ الحق کی زندگی ہمیشہ اردو فارسی و عربی ادبیات کی تحقیقات کے لئے وقف رہی۔ ان کے علمی و تحقیقی و تنقیدی مضامین انگریزی و اردو کے اکثر و بیشتر رسائل و جرائد میں چھپ کر ارباب علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو کی تالیف میں محفوظ الحق سے بھی مدد لی تھی۔

۱۹۲۷ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی رکنیت کے علاوہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک لائبریری سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک اس سوسائٹی کے JOINT PHILOLOGICAL SECYR جوائنٹ فیلولوجیکل سکریٹری اور فیلو بھی رہے۔ کلکتہ کے مشہور انگریزی ادبی رسالہ BENGAL PAST & PRESENT کے ایڈیٹر مسلم انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ایران سوسائٹی کے ممبر بھی رہے۔

محفوظ الحق کا شمار کلکتہ کی ان چند اہل علم و عظیم المرتبت ہستیوں میں ہوتا ہے جن پر نہ صرف فارسی ادب بلکہ اہل بنگال کو بھی بجا طور پر ناز ہے۔ انکی فارسی دانی اور مذاق علم و ادب عدیم المثال و قابل ستائش ہیں ؎

زندۂ جاوید ماند ہر کہ نکو نام زیست
کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

فہمی

ابو المکارم سلیم اللہ فہمی اردو زبان کے مشہور انشاء پرداز اور شاعر ہیں۔ عمر تقریباً پچاس سال۔ کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ اپنی

ایک کتاب "مشرق" کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"پیدائش، تعلیم و تربیت، روایات اور تشکیل مذاق کے اعتبار سے اس کتاب کا مصنف قطعی طور پر بنگالی ہے اور بنگال ہی کو اپنا وطن جانتا ہے اس لئے کہ اس کا خاندان تین پشتوں سے اسی دنیا میں آباد ہے۔"

فہمی نے کلکتہ یونیورسٹی سے درجۂ اوّل میں ایم۔اے (فارسی میں) کرنے کے بعد بنگال سول سروس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ متحدہ بنگال میں محکمۂ تعلیمات کے اسسٹنٹ سکریٹری، مشرقی بنگال میں سیلف گورنمنٹ کے سکریٹری، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ و کلکٹر کھلنا، رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹی مشرقی بنگال کے عہدوں پر فائز رہے اور اب ڈائرکٹر آف ڈیولپمنٹ اینڈ رورل اکسٹینشن ایسٹ (پاک)

DIRECTOR OF DEVELOPEMENT AND
RURAL EXTENTION EAST PAKISTAN.

کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ کئی بار لندن، سوئٹزرلینڈ، ایران اور دیگر ممالک کی سیر و سیاحت بھی کر چکے ہیں۔

مجسمۂ اخلاص و مروت اور مرنجان مرنج انسان ہیں ساری زندگی زبان و ادب کی خاموش و بے لوث خدمت میں گذری۔ انگریزی، فارسی، عربی، اردو اور بنگالی ادبیات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بنگالی زبان سے بے شمار شہ پارے اردو ادب میں منتقل کئے۔ بنگالی ادیب کی حیثیت سے بھی انکا تذکرہ بنگالی زبان کے مقالات میں اکثر آتا ہے۔ بنگالی ادب کے ممتاز و مشہور انشاء پرداز محبوب العالم کی مقبول کتاب "سنکاٹ کیٹے جا چھے" میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس وقت بنگال میں ([illegible]) تین اچھے مترجم ہیں: سلیم اللہ فہمی۔ احسن احمد اشک۔ اور محمد یونس احمر، جن کو

بنگالی زبان سے براہ راست اردو میں منتقل کرنے کی استعداد کامل حاصل ہے۔ اور اس لحاظ سے انھیں بنگال میں اردو کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ ڈھاکہ ریڈیو سے ان کی اردو، بنگال اور فارسی، ادبیات سے متعلق اکثر تقاریر نشر ہوتی ہیں۔

فارسی زبان سے بھی ان کا خاص تعلق رہا ہے۔ اپنے والد مرحوم سے اکثر فارسی میں گفتگو فرماتے اور اسی زبان میں ان سے خط و کتابت کرتے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے فارسی میں ایک روزنامچہ تحریر فرمایا تھا جو ان کی فارسی دانی کا بین ثبوت ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے ان کا ذاتی کتب خانہ بنگلہ، عربی، فارسی، اردو، انگریزی، علوم و فنون کی تقریباً پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے جو ان کے علمی و ادبی ذوق و شوق کا مظہر ہے — کتب خانہ ۱۹۲۷ء میں اپنے والد مرحوم مولانا محمد فہیم اللہ کی یادگار میں قائم کیا تھا۔

نہتی کی ایک تصنیف مشرق کے نام سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکی ہے یہ کتاب دراصل بارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے جو ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی جا چکی ہیں۔ ہر تقریر مشرقی بنگال کی تاریخی، جغرافیائی، تمدنی، ثقافتی اخلاقی اور ادبی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی آئینہ دار ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب قابل قدر ہے۔

شاعری میں حضرت وحشت کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے چند اشعار سنئے۔

آب اس کی آب کوثر سے لذیذ	تند ہے کب اس کے خنجر سے لذیذ
دستِ وحشت میں اسی کا لطف ہے	کچھ نہیں ہے اس میں پتھر سے لذیذ
رات دن کھاتا ہوں جی بھرتا ہوں	کچھ نہیں غم ہائے دلبر سے لذیذ

ملک کی ہر چیز اچھی ہے سکیم اس کے فاقے بھی مزعفر سے لذیذ

آرزو

آرزو سہارنپوری کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کوئی ۵۲-۵۵ سال ہوگی۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "الہام سحر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بقول رضا علی وحشت آپ کے جذبات ایک دلگداز طریقہ سے شعر کی شکل اختیار کرتے ہیں"۔ ۵

عشق کی ہر نوا مطلوب — حسن کی، مجھ سے ہر ادا منسوب
دیدنی ہے قلندری میری — کبھی سالک ہوں اور کبھی مجذوب
عشق کا ایک پرتو سادہ — جوہر حسن جلوۂ محبوب
ان کی ندرت پسندیاں توبہ — کبھی طالب ہیں اور کبھی مطلوب

مذکورۂ بالا تواعد کے علاوہ قربان علی عصری (تلمیذ وحشت) حکیم مولانا عبدالرحمن بیخود ایم۔اے خان بہادر مرزا جعفر علی کشفی ایم۔اے اسحٰق اثر مرزا اصغر علی غافل (تلمیذ اکمل مرحوم حال مقیم مشرقی بنگال) ڈاکٹر آفتاب احمد شریف چکوال قابل ذکر ہیں:۔

چوتھا دَور

تیسرا گروپ

ہوشؔ گذشتہ تیس سال سے اب تک کلکتہ کے جن جواں سال فن کاروں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث اور غیر معمولی سی خدمت انجام دی ہے۔ ان میں ابراہیم ہوشؔ سب سے اوّل قابلِ ذکر ہیں۔ ہوشؔ کے وجد آفرینی نغمے نہ صرف ہر بزم ادب اور محفل سخن میں گونجتے رہے ہیں بلکہ ان کی تخلیقاتِ نظم و نثر کلکتہ کے ہر اخبار و رسالے میں خصوصاً اور ہند و پاک کے جرائد میں عموماً چھپتے رہے ہیں۔ ہوشؔ

کی پُرخلوص جدید انداز تحریر نے جو کلکتہ کے نوجوان اہل قلم کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اکثر نوجوان آپ کی رہنمائی میں جادۂ علم و ادب پر گامزن ہیں۔

ہوش کا اصل نام محمد ابراہیم، تخلص ہوش، اور ادبی نام ابراہیم ہوش ہے۔ مقام ولادت کلکتہ ہے اور آجتک وہیں کی فضا میں مسرور و شادمان ہیں۔ مدرسہ عالیہ اور اسلامیہ کالج میں تعلیم کی منزلیں طے کیں۔

شاعری میں آرزو لکھنوی سے کسب فن کیا۔ وحشت کے دامن فیض سے بھی وابستہ رہے۔

ابراہیم ہوش۔ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، سیاست داں، صحافی، دوست نواز اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن اخبار نویسی ان کا محبوب مشغلہ ہے جو "تو من شدی و من تو شدم" کا مصداق ہے۔

متعدد اخبارات و رسائل روزنامہ اقبال بمبئی۔ ہفت روزہ نظام بمبئی وغیرہ کے چیف ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ عصر جدید و ہند، آزاد ہند کلکتہ کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ فی الحال روزنامہ آبشار کلکتہ کے ایڈیٹر ہیں۔

ان کی طبیعت کی بے نیازی و لاپروائی کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے پاس محفوظ نہیں رکھتے۔ ان کے صرف وہی مضامین نظم و نثر محفوظ ہیں جو اخبارات و رسائل کی آغوش میں پناہ لے چکے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے شعرائے بنگال کا تذکرہ مسلسل نظم میں لکھا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جب میں نے کلکتہ میں (روزنامہ آزاد ہند کے دفتر میں) اس نظم کے متعلق ان سے دریافت کیا تو انھوں نے ہنس کر جواب دیا کہ وہ ضائع ہوگئی۔ یہ نظم ان کا ایک قابل قدر کارنامہ تھی اور اس کے ضائع ہونے کا افسوس انہیں تو نہیں مگر مجھے ضرور ہے۔ ابراہیم ہوش کی ہر دلعزیزی و شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اخبارات

اخبارات ہند "عصر جدید" کے کالم میں "نالہ پابند نے نہیں ہے۔" کے عنوان سے فکاہات کے علاوہ "کلکتہ اردو" کے زیر سرخی بڑی مزیدار چیزیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں کلکتہ کے عوام کی بول چال اور غیر تعلیم یافتہ طبقے کے ماحول کا صحیح نقشہ ہوتا تھا جو ٹھیٹ بنگلہ، گلابی اردو اور ایک خاص زبان کا خوبصورت MIX TURE ہوتا تھا۔ جسے ہر پڑھنے والا شیریں گھونٹ سمجھ کر پی جاتا تھا یہ سلسلہ بیحد دلچسپ اور دلآویز تھا۔ اس سے نہ صرف عوام کو اپنی غلط بولی کی اصلاح کا موقع ملتا تھا بلکہ ان میں اردو پڑھنے لکھنے کا شوق دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا تھا۔

اب ہوش کی ایک غزل کے تین اشعار سنیئے :۔

تو اپنے جلوہ ہائے خاص کو کیوں عام کرتا ہے
یہ ارزانی مرے دل کو گراں معلوم ہوتی ہے

نہیں محفل میں کوئی محرم سوز دروں میرا
مگر اک شمع میری رازداں معلوم ہوتی ہے

فغاں کو ہوش میں نے کر دیا تھا نذر خاموشی
خموشی بھی مری ان کو فغاں معلوم ہوتی ہے

احمر

محمد یونس نام۔ تخلص احمر۔ وطن کلکتہ۔ عمر تیس تینتیس سال ۱۹۴۹ء میں اردو میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ پہلے آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے منسلک تھے۔ ۱۹۴۹ء میں ایم۔ اے کے بعد ڈھاکہ ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ ریڈیو پاکستان کراچی ہو گیا۔ کراچی کی آب و ہوا راس نہ آئی اور ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ واپس چلے گئے۔ اب وہیں مقیم ہیں۔

کلکتہ میں سب سے زیادہ لکھنے والوں میں ابراہیم ہوش کے بعد یونس احمر کا نام آتا ہے۔ ان کی نظمیں، افسانے، علمی و ادبی مضامین اور ترجمے نہ صرف بنگال کے اخبارات و رسائل بلکہ پاک و ہند کے متعدد جرائد میں بھی اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ خاص کر ترقی پسند حلقے میں بہت مشہور ہیں۔ احمر کے طبعزاد افسانے اور مضامین ان کی انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں۔ لیکن وہ اپنے حسن افکار جمیل و بلندیٔ تخیل کے باعث ممتاز درجہ رکھتے ہیں وہ بنگال کے آتش فشاں شاعر قاضی نذرالاسلام کی رفاقت اور گہرا مطالعہ ہے۔ نذرالاسلام کی بعض نظموں کا کامیاب ترجمہ جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے بھی کیا ہے۔ اور پروفیسر اختر حسین رائے پوری نے بھی۔ لیکن قاضی نذرالاسلام کو اصل روپ اور اصل حالت میں دنیائے اردو سے روشناس کرانے کا سہرا یونس احمر کے سر ہے احمر نے معدودے چند کے نذرالاسلام کی بعض کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کردیا ہے جن میں "زہریلی بانسری"، اور "طغیان" قابل ذکر ہیں جو اردو ادب کی گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ترجمے کے علاوہ احمر نے نذرالاسلام کی شاعرانہ عظمت اور ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مقالے لکھے جو "ماہ نو"، "ادب"، "افکار"، "نقوش"، "جدید اردو" وغیرہ میں چھپے۔ احمر نے نذرالاسلام کی تخلیقات کو اردو دنیا میں پیش کرکے نہ صرف بنگلہ ادب بلکہ اردو ادب پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔

احمر کے طبعزاد افسانوں کا ایک مجموعہ "سنگریزے" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ افسانے اکثر بیسویں صدی دہلی میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تقسیم بنگال کے قبل انھوں نے ایک دو ماہی رسالہ "نئے دھارے" کے نام سے سویرا لاہور کے طرز پر جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ کلکتہ کے بہترین لکھنے والوں

کے رشحاتِ قلم سے مزین ہونا۔ افسوس ہے کہ وہ تین اشاعت نکال سکے۔

اشکؔ پروفیسر احسن احمد اشکؔ کا سال پیدائش جنوری ۱۹۱۸ء بمقام کلکتہ ہے۔ پروفیسر مولوی عبدالمقتدر[1] مرحوم جن کا شمار ہندوستان کے مشہور مستشرقین میں ہے ان کے والد ماجد تھے۔

احسن احمد اشکؔ نے ۱۹۳۳ء میں مدرسہ عالیہ سے میٹرک ۱۹۳۶ء میں اسلامیہ کالج سے بی۔اے (آنرز کے ساتھ) ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں اوّل رہے ۱۹۴۳ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ کے عہدۂ معلمی پر مامور ہوئے تقسیم بنگال کے بعد سے اب تک ڈھاکہ انٹرمیڈیٹ کالج میں شعبہ جات اردو بنارس کے پروفیسر ہیں۔

اسلامیہ کالج کے ایام طالبعلمی میں رضا علی وحشتؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ لیکن شاعری میں باقاعدہ اکتساب فن علامہ جمیلؔ مظہری سے کیا۔

احسن احمد اشکؔ کئی سال تک ماہنامہ جدید اردو کلکتہ کے ایڈیٹر بھی رہے اور اب بزم احباب ڈھاکہ کے سکریٹری ہیں۔

احسن احمد کی تحریر نہایت شگفتہ اور دلکش ہوتی ہے۔ نذر الاسلام کی آتش فشانیوں، اقبال کی فلسفیت اور جمیل مظہری کی اخلاقیات سے بیحد متاثر ہیں قاضی نذر الاسلام کی نظم ذسٹر کا ترجمہ نہایت دلنشین و شگفتگی سے کر رہے ہیں جو ماہنامہ دلربا ڈھاکہ میں برابر چھپ رہا ہے۔ نذر الاسلام کے متعلق انکی ایک کتاب مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز ڈھاکہ کے تحت زیر طبع ہے۔ ایک مجموعہ کلام "برق زباراں" شائع ہوچکا ہے۔

---

[1] عبدالمقتدر کا تذکرہ "پہلا گروپ" میں کیا جاچکا ہے۔

افسر | نام ظہیر عالم صدیقی قلمی نام افسر ماہ پوری۔ تخلص افسر۔ سن پیدائش ۱۹۱۹ء بمقام موضع ماہ پور، ضلع سارن (بہار) ۱۹۳۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹریکولیشن کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ہوم (ریکارڈس) ڈیپارٹمنٹ حکومت متحدہ بنگال کلکتہ میں ملازم ہوئے۔ دو سال برہم پور مرشد آباد میں رہے تقسیم بنگال سے اب تک ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں۔

مشرقی پاکستان میں جتنے جواں سال شعراء تقسیم کے بعد سے سکونت پذیر ہیں ان میں افسر ماہ پوری کا درجہ نہایت ممتاز ہے۔ وہ ایک خوش فکر ادیب بھی ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوتا ہے۔ شروع میں ایک عرصہ تک افسانے لکھتے رہے جو متحدہ ہندوستان کے اکثر رسالوں میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں تقریباً ایک نظم کہی جو بحد پسند کی گئی۔ ڈھاکہ میں پہلی مرتبہ غزل کہی اور مشاعرے میں شرکت کی۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ متعدد مقالات ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ افسر ماہ پوری کا شمار ہند و پاک کے اُن جواں سال فنکاروں میں ہے جو بہت کم لکھتے ہیں مگر بہت عمدہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دائرۂ ادب[1]، ڈھاکہ ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کی غرض سے عالم وجود میں آیا، اس کے بانی اور پہلے سکریٹری ہیں۔

بخوفِ طوالت چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہیں ؎

---

[1] راقم الحروف کو بھی اس کے بانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

عجیب چیز محبت کی واردات بھی ہے
حدیثِ دل بھی ہے رودادِ کائنات بھی ہے

اِدھر بھی اٹھتی ہے اربابِ انجمن کی نظر
کچھ آپ ہی نہیں محفل میں، میری ذات بھی ہے

گزری ہے انھیں طغیانیوں میں زندگی اپنی
ہمیں معلوم ہے لطفِ خدا و ناخدا کیا ہے

بدلنا ہی پڑے گا اب نظامِ میکدہ ساقی
ہزاروں رند ہیں دو ایک پیمانے سے کیا ہوگا

بجا ہے دیر و حرم کا بھی احترام مگر
خیال عظمتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ساحل پہ اور تیزی سے کشتی پہنچ گئی
اس رنگ سے بھی گذرا ہے طوفاں کبھی کبھی

کلیم اللہ

ابو الفضل کلیم اللہ زندگی کے بتیسواں سال پر گامزن ہیں۔ وطن کلکتہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے اسلامی ہسٹری اور کلچر میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد بی۔ بی۔ سی لندن چلے گئے۔ انگریزی لٹریچر سے انھیں کافی شغف ہے۔ مضمون نگاری کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ مشہور ادیب و شاعر ابو المکارم سلیم اللہ فہمی کے چھوٹے بھائی ہیں۔

کلیم اللہ کے افسانے و مضامین اکثر و بیشتر ماہنامہ جدید اردو کلکتہ، خاور ڈھاکہ اور دلربا ڈھاکہ میں شایع ہوتے رہے۔ فی الحال ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

نظیر

نام سید نظیر حسین - قلمی نام نظیر جمیلی - سن پیدائش ۱۹۱۴ء وطن بھکن پور ضلع مظفر پور (بہار) ہے - بچپن سے تقسیم ہند تک برابر کلکتہ میں رہے - کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں فارسی میں ایم اے کیا - علامہ جمیل مظہری کے خالہ زاد بھائی ہیں - ان کا شاعرانہ ذوق اور علمی مذاق جمیل کی صحبتوں اور محنتوں کا مرہون منت ہے - مشورۂ سخن بھی جمیل سے کرتے ہیں - بیدار مغز شاعر ہیں - زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں - نظم و نثر پر مادی قدرت ہے - ان کے متعدد مضامین ماہنامہ نگار میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں - ان کے افسانے کا ایک مجموعہ "گوہر" نگار بکڈپو لکھنؤ کے تحت زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکا ہے - فی الحال فرسٹ سکریٹری انڈین امبیسی طہران ہیں -

نظیر جمیل کے صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیسی ہوا چلی تھی سب کچھ جھلس گئی ہے
رنگینیٔ تمنا ، رعنائی جوانی

جو کچھ تھا لٹ چکا ہے جو کچھ ہے لٹ رہیگا
سرمایۂ محبت ، سامانِ زندگانی

یہ زندگی کی لعنت کچھ کم نہ تھی کہ اُس پر
بخشا گیا ہے ہم کو " احساسِ زندگانی"

نجمی

حسن نجمی کا وطن سکندر پور ضلع بلیا یو - پی اور تاریخ پیدائش یکم نومبر ۱۹۱۴ء ہے - اردو، فارسی انگریزی اور ہندی زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں - پندرہ سال سے مدنا پور (مغربی بنگال) میں قیام ہے

اور ادبی زندگی یہیں پروان چڑھی۔ ۱۹۳۰ء سے مختصر افسانے لکھتے ہیں جو ملک کے مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء سے شعر کہتے ہیں۔ باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں۔ لیکن اکثر پروفیسر پرویز شاہدی اور اور شریف چکوالی کو اپنا کلام دکھالیا کرتے ہیں۔ نثر نگاری میں ابراہیم ہوش مدد لیتے رہے۔ آپ کے افسانے انسانی زندگی کی سچی تصویر اور نظمیں حیات و جذبات کی حامل ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ از خروارے ایک غزل ہدیۂ قارئین ہے ؎

دوست مستقبل کا روئے ضوفشاں دیکھا کیے
اور ہم چپ چاپ ماضی کے نشاں دیکھا کیے
ہم تن آسانی کے خوگر ڈھونڈتے منزل کہاں
دور ہی سے گردِ راہِ کارواں دیکھا کیے
عقل نے پیراہنِ ہستی کے ٹکڑے کر دیئے
اور ہم دستِ جنوں میں دھجیاں دیکھا کیے
کون ڈوبا کون ابھرا ہم کو اس کا کیا پتہ
ہم تو رقصِ موجِ بحرِ بیکراں دیکھا کیے
اپنی روداد محبت گو بہت دلچسپ تھی
پھر بھی ہم بنجمیؔ، حدیثِ دیگراں دیکھا کیے

ذاکر

عبداللہ نام تخلص ذاکرؔ۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور آج تک وہیں مسکن گزیں ہیں۔ میٹرک پاس ہیں۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں۔ علامہ عبدالرحمٰن آصف کے تلمیذ رشید ہیں۔ فن عروض

پر کامل قدرت ہے۔ زبان نہایت شستہ و سلیس ہے کلکتہ کے بے شمار طالب علم آپ کے فیض علم و ادب سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ مگر کبھی استادی و شاگردی کے قائل نہیں ہوئے ؎

نگہ یار نشیلی بھی ہے ہشیار بھی ہے
برق انداز بھی ہے نرگس بیمار بھی ہے

آنکھوں سے قتل کرے ہونٹوں سے زندہ کرے
وہ مسیحا بھی ہے اور قاتلِ خونخوار بھی ہے

منزلِ عشق کچھ آساں نہیں اے ذاکر
راہ دشوار بھی ہے وادیٔ پُرخار بھی ہے

عطا عطا الرحمن نام۔ تخلص عطا۔ دنیائے شاعری میں "عطا آصفی" مشہور ہیں۔ عبد الرحمن آصف سے شرفِ تلمذ ہونے کی بنا پر اپنے کو آصفی لکھنا باعثِ فخر تصور کرتے ہیں۔ وطن کلکتہ۔ سن پیدائش ۱۹۲۱ء۔ بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ فنِ شاعری و عروض پر قادر ہیں طبیعت میں بلا کی روانی اور موزونیت ہے۔ آپ فارغ الاصلاح ہیں۔ کلکتہ کے بہت سے شاعران سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

ایک مجموعۂ کلام "جلوۂ زار" چھپ چکا ہے۔ "خالص اردو میں" بھی اکثر غزلیں کہی ہیں جو بالکل آرزو لکھنوی کی "خالص اردو" کے رنگ میں ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آنچل کو ہواؤں کے جھونکوں کا وہ سرکانا
پھلواری کے کونے میں وہ تیرا مسرک جانا

آنسو نہ بہاؤ، تم بھڑکے گی لگی جی کی
یہ پانی کے چھینٹوں سے ہے آگ کا بھڑکانا
انزا آئے وہ کیا جی میں دیکھا ہو عطا جس نے
کلیوں کا بکس جانا پھولوں کا بکھر جانا

تقسیم بنگال کے بعد سے اب تک ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں۔

خلش رشید الزماں نام۔ خلش تخلص۔ وطن کلکتہ۔ عمر ۳۲ سال۔ ۱۹۴۷ء میں پریسیڈینسی کالج اور اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے زمانے میں وحشتؔ کلکتوی اور پروفیسر عباس علیخاں بیخودؔ جیسے بلند پایہ شعراء اور شفیق اساتذہ سے مستفیض ہوئے خضر پور کے علاقہ میں جہاں علامہ آرزوؔ لکھنوی مرحوم کا قیام تھا۔ وہیں خلشؔ کی بھی رہائش تھی۔ چنانچہ علامہ مرحوم کی رقابت سے کافی فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا اور باقاعدہ زانوئے تلمذ موصوف کے آگے تہہ کیا۔ کلکتہ کے جواں سال شاعروں میں خلشؔ ممتاز شاعر ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے سکریٹریٹ میں ملازم ہیں۔ تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔

خلش خضر پور کی مشہور ادبی انجمن "بزم سخن" کے بانی اور سکریٹری ہے۔ آزاد مرحوم انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اکثر نوجوان شعراء کو ان کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

میکدے میں جام مے ساقی نے اک اک کو دیا
اور ہم ہر بار ہاتھ اپنا بڑھا کر رہ گئے
دو دن کی سرکشی کی ندامت ہے آج تک
اچھا ہوا کہ ہم نہ بہت دن جوان رہے
جہاں میں سیکڑوں طوفاں اٹھے گذر بھی گئے
کسی کا سر نہ اٹھا تیرے آستانے سے

عابد عبدالمعبود المتخلص بہ عابد مولانا حکیم عبدالرؤف قادری داناپور کے صاحبزادے ہیں۔ حکیم عبدالرؤف داناپوری سنہ ۱۹۰۰ء سے آخری دم تک برابر کلکتہ میں رہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں وہیں رحلت فرمائی۔ ان کا شمار کلکتہ کے مشہور و معروف علماء و فضلاء میں ہوتا ہے۔ متعدد تصانیف انکی یادگار ہیں۔

عبدالمعبود عابد کے بڑے بھائی عبدالودود قادری مرحوم نے اردو لائینو مشین بنائی اور قادری لائینو ٹائپ ایجاد کیا تھا۔ اسی ٹائپ میں مدت تک اردو "ڈان" اخبار کراچی شائع ہوتا رہا۔ ان کے چھوٹے بھائی جو بنگال سول سروس کے امتحان میں مسلمانوں میں اول آئے تھے اس وقت کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے سکریٹری ہیں۔

عابد کو نہ صرف اردو شاعری بلکہ نثر نگاری سے بھی فطری لگاؤ ہے۔ سنہ ۳۵ء میں کلکتہ کے ایک ہفتہ وار "کلکتہ ویکلی" میں نائب مدیر رہے۔ اس وقت سے ۱۹۳۹ء تک کلکتہ کے متفرق روزناموں اور ہفت روزوں میں مترجم اور مدیر معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے

شمالی و مغربی ہند کے متعدد اخبارات کے نامہ نگار خصوصی بھی رہ چکے ہیں۔ سیاست سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کلکتہ مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری کی خدمات انجام دی۔

تقسیم کے بعد ۴۷ء میں ڈھاکہ پہنچے۔ وہاں کی سب سے پہلی ادبی انجمن "دائرہ ادب" کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۹ء سے ابتک محکمہ نشر و اشاعت حکومت بنگال (تقسیم کے بعد سے حکومت مشرقی بنگال) سے منسلک ہیں۔

عابد موجودہ دور کے ایک قابل قدر فنکار ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں پہلی غزل کہی۔

علامہ وحشت کلکتوی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہیں۔ طبیعت کا خاص رجحان غزل گوئی کی طرف ہے ؎

روش روش ہم نے دیکھ لی ہے کہیں نہیں دل لگا ہمارا
بہار میں زندگی نہیں ہے خزاں میں غارتگری نہیں ہے

جہاں پہ بینش فریب کھائے جہاں بصیرت کو شرم آئے
نظر کا وہ منتہا ہماری کبھی نہیں ہے کبھی نہیں ہے

دیکھ کر ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کو مرے
مجھ سے کیوں بیزار ہے اللہ بھی ملاح بھی

نمودِ گل سے ہے فصلِ بہار کی زینت
وگرنہ خار سے گلشن کبھی نہیں خالی

ظہور | حلقۂ ارباب ادب "ظہیر الحق مبارکی" کے نام سے یاد کیے جاتے

ہیں۔ ان کے والد بزرگوار محمد ذکریا مرحوم ڈھاکہ کے نواب خاندان کے طبیب خاص تھے۔ انگریزی کی معمولی تعلیم ہے۔ ذاتی مطالعہ کے ذریعہ اردو فارسی اور عربی میں اچھی استعداد پیدا کی ہے۔ بفضل تعالیٰ حافظ قرآن بھی ہیں۔

پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے یکتائے روزگار استاد کی فیض صحبت نے ظہور کی شاعری کو بہت بلند کر دیا ہے۔ مشاعروں میں اپنا کلام روح نواز وجد آفریں ترنم سے پڑھتے ہیں اور محفلوں میں پوچھا جاتے ہیں۔

چند اشعار ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں ؎

ذاتِ وحدت میں نہاں ہے وصفِ کثرت سے عیاں
کتنا عریاں ہے ترا جلوہ جہاں مستور ہے

جو گذر چکا ہے خودی سے وہی ہے خدا رسیدہ
ملی بے خودی سے مجھ کو یہ حدیثِ عارفانہ

کون سہ سکتا ہے حیاتِ جاوداں کی تلخیاں
زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

قہر ہے جب ٹوٹ جائے خود فریبی کا طلسم
خود فریبی کے سہارے زندگی آسان ہے

نہ جائے گی رائگاں کبھی بھی یہ اہلِ گلشن کی آہ وزاری
خزاں رسیدہ چمن سے اٹھا رہیگا ابرِ بہاراں گھٹ کر

شمس

عظیم آباد (بہار) میں پیدا ہوئے اس لئے شمس عظیم آبادی کہلاتے ہیں حالانکہ بچپن سے لے کر ۱۹۴۶ء تک برابر کلکتہ

میں رہے تعلیم مدرسہ عالیہ میں حاصل کی۔ کلکتہ کے جواں سال شاعروں میں ابراہیم ہوش کی طرح شمس کا کلام بھی مقبول خاص و عام ہے۔ ہوش اور شمس یہ دو شاعر ایسے ہیں جو اپنے ترنم کی سحر طرازیوں سے ماحول میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور کلام کی خوبیاں تو سونے پہ سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

شمس نے سنہ ۱۹۳۲ء جرم محمد آبادی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا غزل ان کی محبوب صنف ہے سنہ ۱۹۴۶ء سے بمبئی میں قیام ہے اور وہاں فلمی گانے لکھ رہے ہیں ؎

تکمیلِ عشق ہوتی ہے قاتل رکے نہ ہاتھ
جب تک میں دم نہ توڑ لوں خنجر رواں رہے

دل کی ضد ہے کہ رہے گیسوئے جاناں کے قریب
چھوڑ دو آج پریشاں کو پریشاں کے قریب

ہو نہ ہو یہ تپشِ سوز دروں کا ہے اثر
کچھ دھواں سا نظر آتا ہے گریباں کے قریب

وہ بھی دن تھے کہ بلا نوش لقب تھا اے شمس
آپ پھٹکے۔ بھی نہیں محفلِ رنداں کے قریب

تاباںؔ سید شاہ عنایت سوئی نام۔ تاباںؔ تخلص۔ تاباں جمالی القادری کے نام سے اکثر غزلیں شائع ہوتی ہیں۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور انقلاب عظیم کے بعد بھی کلکتہ کے ہو کر رہے۔ عمر تقریباً ۳۰-۳۲ سال۔ سات آٹھ سال سے وحشت کلکتوی سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔

تاباں جمالی القادری کی پہلی تالیف "جام نو" کے نام سے سنہ ۱۹۴۶ء

ہیں مکتبۂ قادریہ" سے شائع ہو چکی ہے۔ جامِ نو[۱]، کلکتہ کے نوجوان اور اُبھرتے ہوئے شعراء و ادباء کا قابلِ قدر تذکرہ ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق امامِ فن وحشتؔ کلکتوی کی یہ رائے سندِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔

" تاباںؔ کلکتہ کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ اُن کو شعر و سخن سے ایک فطری مناسبت ہے ان کی طبیعت کی روانی، الفاظ کے حسن و قبح کی پہچان اور تخیل کی ندرت نے انہیں صفِ شعراء میں ایک ممتاز جگہ دی ہے "

تاباںؔ کا پہلا مجموعۂ کلام موسوم بہ " شامِ روح " ۱۹۵۱ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ بطورِ نمونہ کلام چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مجبور ہو کے ترکِ تمنا کروں جو میں
یہ بات بھی نہیں ہے مرے اختیار کی

کسی طرح تو سنانا ہے حالِ دل ان کو
بنا رہا ہوں حقیقت کو اپنی افسانہ

کہہ گئی محفل میں ان سے مرے دل کی داستاں
وہ نگاہِ یاس جس کو بے زباں سمجھا تھا میں

اخترؔ

علی اختر کلکتہ کے نہایت پُرگو شاعر اور خوش فکر ادیب ہیں افسانہ ڈرامہ، ترجمہ، ادبِ لطیف، نظمِ معراء، سانیٹ غرضکہ نظم و نثر کے ہر صنف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ فارسی، انگریزی اور اردو، ادبیات

---

[۱] جامِ نو میں راقم الحروف کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

کا نہایت وسیع مطالعہ کیا ہے - ہر ادب پر تنقیدی نظر رکھتے ہیں - تقسیم بنگال سے اب تک مشرقی بنگال میں مقیم ہیں اور اپنے ذاتی پریس NEW MAN کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں
اوائل عمر سے شعر کہتے ہیں - چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں -

شکست ذوق نظر کے سوا کچھ اور نہیں
جمی ہو ایک ہی نکتہ پہ گر نگاہ تیری

زوال عشق سمجھ، عشق میں خردمندی
نہیں ہے عقل، محبت میں خیر خواہ تیری

مری نظر کی خطا تھی کہ میں خراب ہوا
مری طرف تھی کہاں بزم میں نگاہ تیری

شاد رشید احمد خاں شاد خضر پوری کلکتہ کے ان جواں سال شعراء میں سے ہے - جن کی طبیعت میں بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے - شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے - بچپن سے شعر کہتے ہیں مزاحیہ رنگ ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے - تبسم لکھنوی سے شرف تلمذ ہے - تقسیم مملکت کے بعد بہ سلسلہ ملازمت لاہور تشریف لے آئے آجکل حیدرآباد سندھ میں قیام پذیر ہیں ؎

آجکل لڑکیاں مدارس کی ایکٹنگ لے اڑی ہیں نرگس کی
ہیں مکدر فضائیں آفس کی دھمکیاں مل رہی ہیں ڈسمس کی
وہ کلفٹن وہ مہ رخوں کا ہجوم یاد آتی ہے شام پیرس کی

متذکرہ بالا فنکاروں کے علاوہ مشرقی بنگال کے شعراء میں

پروفیسر شمس شیدائی ایم۔اے۔ احمد صدیقی بنگالی، گوہر شادانی، پروفیسر حنیف فوق عطاالرحمٰن جمیل، اختر پیامی، مسعود کلیم، کلیم سہسرامی، وحید قیصر ندوی (نمائندہ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان) شمیم پھلواروی، بشیر ملا ٹھوی، یحییٰ طرب۔ (وفا براہی ادارہ مغربی بنگال میں محمد یعقوب افضل بی۔اے خضر پوری، ڈاکٹر رضی احمد رضی ناطقی۔ عبدالرحیم رحیم خضر پوری۔ عبدالصمد شیدا خضر پوری تلمیذ ناوک لکھنوی، محمد اسمٰعیل فائز آصفی۔ محمد ہاشم آصفی، علی حسن فہمی تلمیذ سالک لکھنوی پروفیسر محمد صابر ضبط ایم۔اے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

چوتھا دور

چوتھا گروپ

اظہر ظہیر الدین محمد یحییٰ نام۔ اظہر تخلص۔ دنیائے ادب میں اظہر قادری کے نام سے مشہور ہیں ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۴۵ء میں اسلامیہ کالج سے بی۔ اے اور سنہ ۱۹۵۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) میں کیا۔ مارچ ۱۹۵۱ء سے ڈھاکہ میں سکونت ہے۔ پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی نائٹ کلاس میں اردو کے پروفیسر تھے اور اب سینٹ گریگریز کالج میں پروفیسر ہیں۔

کیپٹن قمر صدیقی مرحوم ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی جیسے اہل علم و فضل کے زیر تربیت تعلیم پرورش پانے کی وجہ سے اوائل عمری سے علم و ادب کا ذوق رہا اور موصوف

مرحوم کی شفقت و محبت نے جادۂ شعر و ادب میں رہنمائی کی۔

ساقی کراچی، جام نو، کراچی دلربا ڈھاکہ اور دیگر رسائل میں ان کے مقالات اور نظمیں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں صنفِ رباعی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ انکی رباعیوں میں صرف یہی نہیں کہ اچھوتے خیالات، گہرے نظریات اور جاں نواز نکات ملتے ہیں بلکہ شاعرانہ رنگینیاں اور فنکارانہ پختہ کاریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک مجموعہ "رباعیات اظہر" مرتب ہو چکا ہے جو اس جواں فکر و جواں سال شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ ایک غزل ہدیۂ ناظرین ہے ؎

ملتفت گر نگاہِ یار نہیں — دل بھی کچھ ایسا بیقرار نہیں
رو کے چاہوں کہ غم کروں ہلکا — اب تو اتنا بھی اختیار نہیں
وہ سمجھتے ہیں شادماں مجھکو — غم جو چہرے سے آشکار نہیں
کیوں خوشی کی ہو آرزو مجھکو — غم تو دل پر کچھ ایسا بار نہیں

پھول مرجھا بھی جاتے ہیں اظہر
زندگانی سدا بہار نہیں

ارشد

نام سید شاہ رشید الرحمن۔ تخلص ارشد سال پیدائش ۱۹۲۹ء ۱۹۴۹ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں بی۔اے آنرز" اور ۱۹۵۱ء ڈھاکہ یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں ایم۔اے کے امتحانات پاس کئے ان دنوں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۲ء سے ہوتا ہے۔ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ تنقیدی مضامین اکثر لکھتے رہے ہیں۔

ایک مجموعۂ کلام "سنگ و سخن" اور ایک مقالات کا مجموعہ "آج کا نقاد" عنقریب منظر عام پر آنے والے ہیں۔

تقسیم کے بعد بہار سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آ گئے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پتے کی بات تھی لیکن چمن سے کون کہے
خزاں نے روپ نکھارا تری بہاروں کا

ترے کرم کا دل غم نواز کیا کہنا
نظر میں ایک ہیں اب سوز و ساز کیا کہنا

یہی جو حال رہا تیری چشم پوشی کا
گناہ کرنے کا پھر کس کو حوصلہ ہوگا

زندگی موت کے پہلو میں ہے اک درد لطیف
اور وہ درد جو بڑھتا ہی گیا کم نہ ہوا

صادق

نام محمد عبدالرزاق تخلص صادق۔ قلمی نام صادق القادری عمر ۲۵ سال۔ وطن کلکتہ۔ اسلامیہ کالج سے بی۔ اے (آنرز) کیا۔ تقسیم کے بعد سے ڈھاکہ میں قیام ہے۔

۱۹۴۷ء سے ابرار حسنی سے اصلاح لیتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

راہ میں بیم و رجا کی وہ تذبذب دل میں ہے
اک قدم منزل کے باہر اک قدم منزل میں ہے

ایک پروانے کا جل جانا تو سب پر کھل گیا
یہ خبر کس کو کہ شمع بزم کس مشکل میں ہے

بے تمنا زندگی انسان کی دشوار تھی
اک نہ اک حسرت نہاں ہر آدمی کے دل میں ہے

قدوس

غلام قدوس صدیقی کلکتہ کے مشہور شاعر عطا آصفی کے چھوٹے بھائی

ہیں۔ ان کا سن پیدائش ۱۹۲۶ء بمقام کلکتہ ہے۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں اور طالبعلمی کے زمانے سے آجتک تقریباً ہر طرحی و غیر طرحی مشاعرے میں غزلوں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ نثرنگاری کا شوق بھی فطری ہے۔ ایام طالب علمی میں اسلامیہ ہائی اسکول میگزین کے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک چیف ایڈیٹر رہے۔ ماہنامہ ارمغاں کلکتہ بھی کئی سال تک انکی ادارت میں نکلتا رہا۔ شاعری میں اپنے برادر محترم عطا آصفی سے استفادہ کرتے رہے۔ حضرت طاہر علی شاکر اور عبدالرحمن آصف کو بھی اکثر اپنا کلام دکھاتے رہے۔ تقسیم بنگال کے بعد سے ڈھاکہ ان کا وطن ثانی ہے ؎

ہے میرے پیش نظر اب بھی صورتِ پرواز
مجھے نہ روک سکے گی مری شکستہ پری

تمہارے ساتھ گذر جائے تو غنیمت ہے
وہ ایک لمحہ سہی عمر جاوداں نہ سہی

پھر جنون عشق شاید رنگ پر آنے لگا
پھر چمن میں دل مرا اے دوست گھبرانے لگا

فصل گل سے تو کہیں دورِ خزاں بہتر تھا
ہائے لٹ جائیگا گلشن مجھے معلوم نہ تھا

نظیر

نام نظیر صدیقی۔ تاریخ پیدائش، ۷ نومبر ۱۹۳۰ء۔ مولد سرائے ساہو ضلع چھپرا (بہار) ۱۹۴۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک۔ ۱۹۴۸ء میں جامعہ اسلامیہ کالج گورکھپور سے انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ ۵۳ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے درجۂ اول

میں ایم۔اے (اردو) کیا۔
۱۹۴۸ء سے ڈھاکہ میں مقیم ہیں نظم و نثر لکھنے کا ذوق فطری ہے نمونۂ کلام یہ ہے۔

ہر ہر نفس ہے موت کی حسرت لئے ہوئے
میں جی رہا ہوں زیست کی تہمت لئے ہوئے

یاد ماضی تلخ ہے اور عکس فردا دل شکن
اے غم امروز اب تو ہی بتا ہم کیا کریں

جو لوگ موت کو ظالم قرار دیتے ہیں
خدا ملائے انھیں زندگی کے ماروں سے

حفیظ حفیظ رزاقی کا سال پیدائش ۱۹۲۸ء بمقام کلکتہ ہے ۱۹۴۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔

نظم و نثر دونوں پہ یکساں قدرت ہے۔ شعر و شاعری میں پروفیسر عباس علیخاں بیخود سے شرف تلمذ ہے ان کی نظمیں ہند و پاک کے اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

ہمیں خوف کیا رقص موج بلا کو ‏ سمجھتے ہیں ساحل کی رخ رواں ہم
غم عشق بن جا غم آدمیت ‏ وفا کی مکمل کریں داستاں ہم

جن پہ کچھ فکر و تصور کے پڑے ہوں سائے
زیست در اصل عبادت انہیں لمحات کی ہے

راشد راشد القادری کی عمر ۲۸-۳۰ سال ہوگی۔ وطن و مسکن شہر کلکتہ

سے ۱۹۴۲ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ علامہ وحشت سے شرفِ تلمذ ہے۔ بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ بہت خوب کہتے ہیں۔ ایک غزل جس کا عنوان "نغمۂ خودی" ہے کے چند اشعار سنیئے ؎

فضائے نو کی بلندیوں سے خودی کا نغمہ سُنا رہا ہوں
ہر ایک ذرے کو رشک خورشید و ماہ و انجم بنا رہا ہوں
میں اپنی لوحِ حیات سے یوں نقوشِ ماضی مٹا رہا ہوں
شرابِ ماضی کی تہ سے اُٹھ کر ایاغِ فردا چڑھا رہا ہوں
ہر اک اشارے پہ آگے بڑھ کر میں بازیٔ جاں لگا رہا ہوں
خرد کو رنگیں فریب دے کر جنوں کی طبیعت بڑھا رہا ہوں

اقبال

نام محمد اقبال حسین۔ تخلص "اقبال" وطن کلکتہ۔ عمر ۳۰ سال۔ شاگرد وحشت نظم و نثر خوب لکھتے ہیں۔ پہلے اقبال کلکتوی اور اب اقبال اعظمی ان کا قلمی نام ہے۔ متعدد اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ جن میں ہفتہ وار نیا سنسار، دلچسپ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غزلوں کی نسبت نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔ ان کی نظموں کا موضوع عموماً اشتراکیت ہے۔

اقبال اعظمی کی ایک نظم بعنوان "اقبال قیصری کا زمانہ گذر گیا" کے چند اشعار ناظرین کے خدمت میں پیش ہیں ؎

انگڑائی لے کے اُٹھ ہی گئی میری بے کسی
اہل دول کا ظلم جو حد سے گذر گیا
مایوس زندگی نے اجل کو بنایا دوست
فاقوں سے جب کہ صبر کا پیمانہ بھر گیا

اٹھو کہ دستِ ظلم کو بڑھ کر مروڑ دیں
ملنا پڑے گا ہاتھ جو یہ دن گزر گیا
خودداریوں کا خون ہوا بے خودوں کے ہاتھ
ہر آنکھ سے خمارِ خودی کا اتر گیا
قلبِ وطن نواز ہیں گر روح پھونک دے
سمجھوں گا میں کہ نالہ مرا کام کر گیا
محکوم اب نہ کوئی رہیگا جہاں میں
اقبالِ قیصری کا زمانہ گزر گیا

ناظر

ناظر الحسینی کی عمر کوئی تیس سال ہوگی۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور قیامت تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں۔ اکثر اپنا کلام علامہ وحشت کو بغرض اصلاح دکھایا کرتے ہیں۔ شروع میں اکثر غزلیں کہتے تھے اب زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے مترجم اور ایڈیٹر رہ چکے ہیں آجکل روزانہ ہند کلکتہ میں مترجم ہیں۔ خالص ترقی پسند شاعر ہیں اور انقلابی شاعری کے دلدادہ۔

ایک نظم "بیزاری" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

دیکھ کر سینۂ عاشق میں جدائی کے داغ
دیکھ کر جلتے ہوئے فصلِ بہاراں میں باغ
دیکھ کر بجھتے ہوئے حسرت و ارماں کے چراغ
دیکھ کر قوم کے افراد کے فرسودہ دماغ
ہند سے دور بہت دور چلا جاؤں گا

ساحَن کلکتہ کے ابھرتے ہوئے نوجوان نثر نگاروں میں جنہوں نے اپنے کثیر التعداد مضامین کے باعث شہرت حاصل کی ہے ان میں ساحَن پردیسی" کا نام سب سے اول آتا ہے ۔ ساحَن کے افسانے برصغیر ہند و پاک کے متعدد رسائل و جرائد مثلاً تجلی کلکتہ ، بیسویں صدی دہلی ، جادۂ محبوپال ، احساس لاہور ، جنسیات ، نفسیات ، سائیکولوجی کراچی ، کائنات لاہور ۔ وغیرہ میں گذشتہ دس سال سے برابر چھپ رہے ہیں ۔ کارواں الہ آباد ، نظام لاہور ، افکار کراچی ۔

ساحَن پردیسی کا اصل نام عبدالغفور اور مقام ولادت کلکتہ ہے ۔ عمر ۲۵ ۲۶ سال ۔ انگریزی تعلیم میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن افسانہ نویسی کے شوق میں انگریزی لٹریچر کی اچھی اچھی کتابیں برابر مطالعہ کرتے اور اُن سے استفادہ کرتے رہے ۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلے گئے ۔ آجکل کراچی میں سکونت ہے ۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں کراچی سے "غزل" نامی ماہنامہ جاری کیا اور اس کے بعد "سراغ رساں" جیسے نئے موضوع پر رسالہ نکالا ۔ اول الذکر رسالہ بند ہو چکا ہے آخر الذکر ہنوز جاری ہے ۔

ساحَن خاص ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اس لئے ان کی تخلیقات ترقی پسند نظریات کی حامل ہوتی ہیں ۔

متذکرۂ بالا فنکاروں کے علاوہ اس گروپ کے شعراء میں سحر کلکتوی بی اے (آنرز) (تلمیذ علامہ آثر ردولوی تلمیذ امیر مینائی) غلام مرتضیٰ قدسی بی اے (آنرز) (تلمیذ پروفیسر عباس علی خاں بیخود ایم اے) یادر حسینی (تلمیذ پروفیسر شور علیگ) مضطر حیدری ۔ نشاط القادری ۔ محمد قاسم صابر خضر پوری ۔ روشن علی عشرت تلمیذ منی لال جواں ، ادیب خضر پوری ، رشید شمیم خضر پوری ، احسان دربھنگوی

وغیرہ اور افسانہ نگاروں میں غلام رسول عشرت انصاری، جاوید نہال ایم۔ اے۔ قیصر نشاط۔ اشتیاق احمد سہیل ادیب اور عابدی فیض آبادی وغیرہ کی بے لوث خدمات قابلِ ستائش ہیں اور ان کی ذات سے اردو زبان و ادب کی بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں۔

تقسیم کے بعد ان میں سے بعض مغربی بنگال (کلکتہ) میں رہ گئے۔ اور بعض مشرقی بنگال چلے گئے۔ اور وہاں کے ادبی ماحول میں چھائے ہوئے ہیں۔

بنگال میں واجد علی شاہ اختر کا زمانہ

اور ان کے ہمعصر شعراء

اختر غدر ۱۸۵۷ء کی بادِ خزاں سے دہلی اور لکھنؤ کے گلستانِ سخن اُجڑ گئے۔ خاتم السلاطین واجد علی شاہ تاجدارِ اودھ کو معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ اور شہنشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج دیا گیا۔ واجد علی شاہ کی ذات سے بنگال کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ نہ صرف اپنے ہمراہ لکھنوی مذاقِ سخن اور سرمایۂ زبان لائے بلکہ اپنے تمام خوشہ چیں اہلِ علم و فضل کو بھی ساتھ لے آئے جن کے ذوقِ شعر و ادب نے "مٹیا برج" کو "لکھنؤ ثانی" بنا دیا۔ بادشاہ واجد علی شاہ کس حسرت و یاس کے ساتھ اپنا محبوب وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے یہ شعر ان کے دلی جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

انھیں نہ صرف فنِ تعمیر سے شوق تھا بلکہ فنِ موسیقی اور رقص و سرود سے بھی بیحد دلچسپی تھی - اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے - ہندی میں "جانِ عالم پیا" اور اردو میں "اختر" تخلص کرتے تھے ٹھیٹ ہندی میں بھی طبع آزمائی کی - ان کی ٹھمریاں اور دادرے وغیرہ آج بھی لکھنؤ کے محلوں اور گلیوں میں مزے لے لے کر گائے جاتے ہیں - ان کے اردو تخلص کے سلسلہ میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ انھوں نے یہ تخلص اختر بنگال کے مشہور و باکمال شاعر قاضی محمد صادق خاں المتخلص بہ اختر سے انعام و اکرام کے عوض خرید لیا تھا - میر مظفر علی اسیر لکھنوی اور نواب فتح الدولہ برق لکھنوی واجد علی شاہ اختر کے استاد تھے - اختر نے قاضی محمد اختر سے بھی مشورۂ سخن لیا -

شاہ اختر نے نظم و نثر کی تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں - مثنوی خوب کہتے تھے ہر شعر درد و تاثیر میں ڈوبا ہوتا تھا - لکھنؤ سے سفر کلکتہ کے حالات "حزنِ اختر" کے عنوان سے نظم کئے جو بہت المناک و دلسوز ہیں - ایک مثنوی کے چند اشعار بطور نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں ؎

وہ رشکِ قمر نہا چکی جب — پہنا کفن اس نے گیروا سب
تسبیح گلے میں ایک ڈالی — اور مانگ بھی بالوں میں نکالی
بالوں کو بھی کر دیا پریشاں — حسن اس سے ہوا اگر دو چنداں
کافور لگایا سب بدن میں — کچھ عطر بھی مل دیا کفن میں
عمامہ بھی باندھا اس نے سر پہ — اور گیروی کی اوڑھی ایک چادر
جسم اپنا چھپا کے سب کفن میں — وہ شمع رخ آئی انجمن میں
اک ہاتھ میں اس کے خنجرِ تیز — اور ایک میں جامِ سم سے لبریز

اک لونڈی کے ہاتھ میں اگر سوز ~ رومال لئے کوئی جگر سوز

داں ناچ کا شغل ہو رہا تھا ~ غلِ سازِ طرب کا جا بجا تھا

مطرب سب کو رجھا رہے تھے ~ اختر کی غزل یہ گا رہے تھے

اکثر اپنے محبوب وطن کی یاد سے تڑپ اُٹھتے ہے

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

حسب ذیل اشعار میں اختر کا خاص رنگ جھلکتا ہے

کمر ڈھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ
شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ

بڑے پیر مجھ سا رند، میخانے میں گر آئے
گرے ساغر، لنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا

ایک طرف لکھنؤ کی محفل شعر و ادب کا چراغ گل ہو گیا تو دوسری طرف "مٹیا برج" کی شاعری میں چار چاند لگ گئے۔ اختر کے ہمراہ جو شعراء لکھنؤ سے مٹیا برج آئے انہیں نہ صرف سیم و زر سے مالا مال کیا بلکہ طرح طرح کے خطابات سے بھی سرفراز کیا۔ چنانچہ مرزا محمد آغا برق کو فتح الدولہ، بخشی الملک، درخشاں کو مہتاب الدولہ، کوکب الملک، ستارۂ جنگ اور اسیر کو تدبیر الدولہ و وزیر الملک جیسے دلکش خطابات سے نوازا۔

خواجہ آتش کے شاگردوں میں حجو اور خلیل بھی لکھنؤ سے مٹیا برج آئے اور اختر کے چشمۂ فیض و دولت سے فیض یاب ہوئے۔

حجو میر اساد ات حسین آغا حجو شرف واجد علی شاہ اختر کے سمدھی تھے ان کا کلام رنگِ تغزل کا آئینہ دار اور غیر مانوس و متروک الفاظ سے

بے باک ہے۔ چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہوں ؎

ٹھہرا گیا ہے لا کے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا کون تھا؟

نکل کے جاؤں کدھر تیری انجمن کے سوا
چمن کی بلبلوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا

خلیل

میر دوست علی خلیل خلف سید جمال متوطن بڑدلی نے نواب نادر مرزا کے ہمراہ کلکتہ کا سفر کیا۔ شاعری میں رعایتِ لفظی کے دلدادہ تھے۔ متروک اور غیر مانوس الفاظ بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ بعض اشعار بہت اچھے ہیں اور حسنِ تغزل کا بہترین نمونہ ؎

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو
اٹھیے اُٹھیے گھر جایئے ادم لے چکے آپ مستاں بہت

مسافر یہ نا آشنائے منزل ہیں
مثالِ ریگِ رواں جائیں کہاں دیکھیں؟

اسیر

سید مظفر علیخاں اسیر، سید امداد علی کے بیٹے، مصحفی کے شاگرد، بادشاہ اختر کے مصاحب اور استاد تھے۔ چھ اردو ایک فارسی دیوان انکی یادگار ہیں فن عروض کے ماہر تھے۔ زبان نہایت عمدہ، حکیم ناطق لکھنوی مرحوم نے اپنی معرکہ آرا غیر فانی تصنیف نظم اردو (صـ۹۴) میں ان کی خصوصیات کلام پر نہایت جامع تبصرہ کیا ہے — "لکھنؤ میں سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے زبان کی سادگی کو مضامین دخیل کی گہرائیوں سے دزنی کر دیا۔"

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشنی اسی کا نام ہے جو جلائے دل

امیر کے شاگردوں میں امیر مینائی سب سے زیادہ مشہور ہوئے ان کے دو بیٹے حکیم اور افضل بھی صاحب دیوان تھے۔

برق — نیّر الدولہ، بخشی الملک خطاب، مرزا محمد رضا خاں نام، برق تخلص، مرزا کاظم علی خاں لکھنوی کے صاحبزادے، ناسخ کے تلمیذ رشید اور اختر کے استاد عزیز تھے۔

اختر سے انھیں بہت محبت تھی جب ترک لکھنؤ کیا اور مٹیا برج میں سکونت اختیار کر لی تو اپنے تعلقات کے تاثرات کا یوں اظہار کیا ؎

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کے اٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کے اٹھے

برق کا انتقال مٹیا برج میں ہوا۔ ایک ضخیم دیوان اپنے پیچھے چھوڑا۔ کلام میں تخیل اور تکلف کے ساتھ ساتھ تاثیر و کیفیت بھی ہے۔ ناسخ سے متاثر تھے اور انھیں کے رنگ میں اکثر و بیشتر اشعار کہے ؎

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

برق کے شاگردوں میں جلالی اور سحر بہت مشہور ہوئے۔

درخشاں — مہتاب الدولہ، کوکب الملک، ستارۂ جنگ خطابات،

سید علی خاں نام، درخشاں تخلص ۔ اسیر سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور اسیر کے توسط سے شاہی دربار میں رسائی پائی ۔ مٹیا برج میں رحلت کی ۔

ان کے علاوہ لکھنؤ کے جو خوش فکر و پُرگو شعراء اختر کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور جن کی شمعِ سخن سے محفلِ ادب روشن رہتی تھی ان میں مظفر علی ہنر (جو غزل میں صبا اور مرثیہ میں مرزا دبیر سے اصلاح لیتے تھے اور شاہ اختر کی دو بیگمات عذرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل عالم اور نواب محبوب عالم کے استاد تھے) حاجی مرزا علی بہار (جو رشک کے شاگرد تھے) عیش اور مالک الدولہ صولت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔

اس زمانے میں بنگال کے ہر چہار طرف شعر و سخن کا کافی چرچا رہا ۔ مرزا نواب خاں داغ دہلی سے اور نظم طبا طبائی دکن سے کلکتہ آئے اور وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں برابر شرکت کی ۔ داغ نے اپنے قیام کلکتہ کا ذکر اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں بڑی محبت سے کیا ہے ۔

نظم — علی حیدر نظم طبا طبائی کو شاہ اختر نے نواب حیدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا تھا ۔ نظم ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کلکتہ آ گئے تھے جہاں مولانا قائم الدین سے فارسی و عربی تعلیم کی تکمیل کی ۔ شاہ اختر نے انھیں اپنا شہزادہ مرزا کام بخش کی تعلیم کے فرائض پر مامور کیا تھا ۔ ۱۳۰۵ھ میں واجد علی شاہ کی وفات کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے[1]

---

[1] نظم طبا طبائی کے مفصل حالات و نمونۂ کلام کے لئے دیکھئے "دکن میں اردو" از نصیر الدین ہاشمی ۔

نواب واجد علی شاہ اختر کے زمانے میں بنگال کے مختلف مقامات میں قاضی محمد اختر اور عبدالغفور خاں نساخ جیسے اکابرین سخن و ماہرین ادب کے علاوہ اور بہت سے باکمال شعراء و مایۂ ناز انشاء پرداز موجود تھے، حاجی عبدالحمید حمید، پروفیسر عبدالغفور شہباز، عبدالودود، عبدالسبحان شاکر، محمد اسمٰعیل شوکت، عبدالعزیز عزیز، میر وزیر علی، اعظم معراج کلکتہ، خواجہ محمد افضل، نواب سید محمود آزاد، سید محمد آزاد (نامہ نگار اودھ پنچ) اکرام احمد ضیغم، غلام احمد تمکین، خواجہ حیدر جہاں شائق، خواجہ عبدالغفار اختر، خواجہ عبدالرحیم صبا، شاہ رؤف احمد رافت سرہندی ڈھاکہ۔ الفت حسین فریاد اور جرأت مرشد آباد، حیدر بخش حیدری۔ اور رمز چاٹگام۔ شاہد فرید پور۔ منظم مالدہ، اسنخ پنڈوا، فدا سلہٹ اور نجم الدین نادر میمن سنگھ کے رہنے والے تھے ان سب کے تذکرے دوسرے اور تیسرے دور کے باب میں درج کیے جا چکے ہیں۔

بنگال میں علامہ آرزو لکھنوی

اور اُن کے تلامذہ

تمہید بنگال میں علامہ خان بہادر رضا علی وحشت کی ناقابلِ فراموش خدمت زبان و ادب میں اظہر من الشمس ہے اور تاریخ ادب اردو میں سنہرے حرفوں سے مرقوم ہونے کے لائق لیکن ان کے علاوہ حکیم علامہ ابو العلا ناطق لکھنوی مرحوم اور علامہ انور حسین آرزو لکھنوی مرحوم جیسے یگانۂ روزگار مستند اساتذۂ فن سخن کا اثر بھی بہت حد تک کلکتہ (مغربی بنگال) کے ادبی ماحول پر رہا۔ ناطق اور آرزو مدت دراز تک کلکتہ میں سکونت پذیر رہے اور بہت سے اہل ذوق ان کے چشمۂ فیض سے مستفیض و فیضیاب ہوئے۔ علامہ ناطق کا "تذکرہ" چوتھے دور کے باب میں شامل کیا جا چکا ہے۔

یہاں علامہ آرزو اور ان کے تلامذہ جو کلکتہ میں عرصۂ دراز سے مقیم ہیں بلکہ کلکتہ

جن کا وطن ثانی ہے، کے مختصر حالات زندگی معہ انتخاب کلام پیش کئے جاتے ہیں۔

آرزو

سیّد انور حسین نام۔ آرزوؔ تخلص۔ ابتداء میں امیدؔ تخلص کرتے تھے سلسلۂ نسب امام ہفتم موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے ملتا ہے۔

۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۷۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے آرزوؔ کے مورث اعلیٰ عہد مغلیہ میں ہرات سے وارد ہندوستان ہوئے اور شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں اودھ کی صوبیداری پر فائز ہو کر لکھنؤ آئے اس وقت سے یہ خاندان یہیں سکونت پذیر ہو گیا۔

آرزوؔ کے والد ماجد سیّد ذاکر حسین یاسؔ اپنے وقت کے مشہور شاعر اور عمائدین شہر میں شمار ہوتے تھے۔ غزل میں جلالؔ اور مرثیے میں میر مونسؔ کے شاگرد تھے۔ آرزوؔ نے شاعری شروع کی تو ابتدا ہی سے وہ رنگ طبیعت تھا کہ شفیق باپ نے اپنے استاد جلالؔ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل کر دیا۔ اور آخر کار بعد وفات جلالؔ، آرزوؔ بہ اتفاق آرا جانشین جلالؔ مقرر ہوئے۔

جلالؔ اپنے عہد کے مسلم الثبوت صاحب فن تھے آرزوؔ نے بھی فن شعر کی طرف پوری توجہ کی اور امامِ فن و مجتہد زبان ماننے گئے۔ اصنافِ سخن میں سوائے واسوخت کے ہر صنف میں کلام موجود ہے، غزل، قصیدہ، اور مرثیہ کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے مثنویوں میں "عدل محمود" اور "دُردانہ" نے بہت شہرت حاصل کی۔ کئی فنی رسالے بھی لکھے جن میں "نظام اردو" اور "میزان الحروف" اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت گرانقدر رسالے ہیں۔ "نظام اردو" میں زبانِ اردو کے قواعد بالخصوص اصنافِ مترادفہ کے علمی استعمال کے قاعدوں کا بیان وہ کارنامہ ہے جس کی مثال دوسری زبانوں کی قواعد کی کتابوں میں ملنا دشوار ہے۔

"میزان الحروف" میں صرف کی "مقدار صوت" سے بحث کی گئی ہے۔ یہ

موضوع بھی بالکل نیا ہے۔

آرزو نے ڈرامے بھی لکھے جن میں "چراغِ توحید"۔ صدائے درویش، جامِ زہر، سیفو عمل کا پھل، متوالی جوگن، دل جلی بیراگن، حسن کی چنگاری، چاند گہن اور بات کا دھنی بہت مشہور ہوئے آخرالذکر پانچ ڈرامے پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ کارنتھین تھیٹریکل کمپنی اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں اسٹیج ہوئے اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

ان کی شہرتِ شاعری سے متاثر ہو کر کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی نیوتھیٹرس نے ۱۹۳۶ء میں خدمات حاصل کیں اور وہ فلم کے گانے لکھنے لگے۔ فروری ۱۹۴۲ء میں نیشنل کمپنی بمبئی کی طلب پر بمبئی تشریف لے گئے۔ اور آخر عمر یعنی ۱۹۵۱ء تک بمبئی میں مقیم رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فلمی دنیا میں آرزو لکھنوی کی وابستگی نیک فال ثابت ہوئی۔ پہلے فلمی گانے عموماً فن و زبان کے قید و بند سے آزاد ہوتے تھے لیکن آرزو کی شمولیت نے ایک حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ اور فن و زبان کی بڑی حد تک اصلاح ہو گئی۔

آرزو اردو کی ایک مکمل اور جامع لغت لکھنے میں مصروف تھے جس کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد ختم ہو گیا۔

نہایت با اخلاق، بامروت بزرگ تھے۔ دنیا و مالِ دنیا کی طرف سے طبیعت مستغنی پائی تھی۔ یہی سبب ہے کہ کبھی کسی کی جھوٹی خوشامد نہیں کی۔ ان کا کلام اہلِ دول کی مدح سے قطعاً پاک ہے۔ خاکسار کو ان کی صحبتوں سے اکثر لطف اندوز اور مستفیض ہونے کا شرف حاصل رہا۔

کسی باکمال شاعر کے جملہ خصوصیاتِ شاعری کو جمع کرنا آسان نہیں البتہ چند نمایاں خصوصیتیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ آرزو کے کلام میں مندرجہ ذیل خصوصیتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جو ان کے کمال کی آئینہ دار ہیں۔

ا:۔ کلام فنی عیوب سے یکسر پاک ہے۔

۲ :- عامیانہ اور سوقیانہ خیالات سے ان کی شاعری کا دامن بالکل پاک ہے۔

۳ :- حقیقت و نفسیات کے نہایت لطیف مظاہر بکثرت سے نظر آتے ہیں۔

۴ :- لطافت زبان ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

۵ :- سلاست و روانی کے ساتھ درد و اثر ان کا خاص حصہ ہے۔

۶ :- انداز بیان میں دلکش ندرت و جدت پائی جاتی ہے۔

۷ :- آہنگ و معنی دونوں کے اعتبار سے الفاظ برمحل و مناسب کا استعمال صرف آرزو کی خصوصیات سے ہے۔

۸ :- متعلق الفاظ اور غریب و ناما نوس ترکیبیں بالکل نہیں آنے پاتیں۔ اگر کہیں کوئی ثقیل لفظ ضرورتاً صرف ہو بھی جاتا ہے تو ایسے محل سے کہ معنی خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

۹ :- طبیعت کی روانی سخت سے سخت زمین کو پانی کر دیتی ہے۔

۱۰ :- قدرت بیان کی صنعت ہر جگہ نمایاں ہے بالخصوص بہت سی چھوٹی بحروں میں مفاہیم نہایت خوبی سے واضح ہو جاتے ہیں اور بھی بحروں میں بھرتی کے الفاظ نہیں آنے پاتے۔

۱۱ :- مشکل اور دقیق مفاہیم جن کا سلجھا کر بیان کرنا نثر میں بھی اکثر دشوار ہو جاتا ہے ان کے یہاں بڑی خوبصورتی سے نظم ہو جاتے ہیں اور مطلب واضح ہو جاتا ہے بلکہ ایسے اشعار زیادہ پر کیف و وجد آفریں ہوتے ہیں۔

۱۲ :- فارسی و عربی کے مقابلہ میں اپنی زبان کے الفاظ سے زیادہ کام لیا ہے اس کی زبردست مثال ایک مکمل دیوان سریلی بانسری کے نام سے موجود ہے جس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جسے اردو کے علاوہ کسی اور زبان کا کہہ سکیں۔ سریلی بانسری کا ایک نسخہ کمترین کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے

اس سے چند اشعار ناظرین کے تفنن طبع کے لئے نقل کئے جاتے ہیں ؎

خالص اردو

جس نے بنا دی بانسری گیت اسی کے گائے جا
سانس جہاں تک آئے جائے ایک ہی دھن بجائے جا
ان کی کس نے اپنی ہار بڑھ کے تھکن بتائیگی
میں یونہی تڑپے جاؤں گا تو یونہیں مسکرائے جا
سب کی متیں پلٹ گئیں سنکیں بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اداس اداس کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں
ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رت پلٹ چلی
کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی
کس نے بھیگے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
یہ پسینا وہی آنسو ہیں جو پی جاتے تھے تم
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ پھوٹا پانی

اب غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

رہنے دو کہ تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہی کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا
کس نے ٹپکا ہاتھ سے ساغر موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی
تلوار اٹھائی پھر رکھ دی ابرو پہ بل آیا لب پہ ہنسی
بس دیکھ لی یہ ٹھنڈی گرمی جلا دینے اور ڈرتے ہو

تو سی نظر اللہ بچائے ڈالتی ہے پتھر میں لکیر
دل کا اشارہ جس کی طرف تھا بیچ سے چپکا عام ہی

پھٹے دامن میں شرح حال چشم خوں فشاں رکھدی
ورق تھا ایک جس پر لکھ کے ساری داستاں رکھدی

جرم

ابوالحسن نام جرم تخلص۔ ان کا شمار آرزو لکھنوی کے مایہ ناز تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی خدمات شاگردان آرزو میں جن کا تعلق کسی حیثیت سے بھی کلکتہ سے رہا سب سے زیادہ قابل قدر اور تحسین آمیز ہیں۔

۴ فروری ۱۹۰۳ء کو اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ محمد آباد میں پیدا ہوئے فارسی کی تکمیل حکیم زوار حسین، مولانا سید محمد ہارون فرنگی پوری کی خدمت میں ہوئی عربی شروع ہی کی تھی کہ فرنگی پور ضلع غازی پور سے محمد آباد آنا پڑا یہاں آکر ریاضی کے شوق میں مڈل اسکول کا امتحان دیا اور وہیں ہندی بھی پڑھی انگریزی اسکول میں داخلہ کی نوبت جب آئی تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا گھریلو ذمہ داریوں نے سفر پر مجبور کیا تلاش معاش میں کلکتہ پہنچے یہاں کی خاک ایسی دامن گیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔

مزاج میں سادگی اور انکساری بدرجہ اتم موجود ہے جس کا ترجمان خود ان کا یہ شعر ہے ؎

زمیں کی طرح جب حاصل ہے قدرت بردباری کی
رہوں گردش میں کیوں اے جرم ناحق آسماں بنکر

نظم و نثر دونوں میدان میں یکساں دستگاہ رکھتے ہیں۔ دس ہزار کا نوٹ، انجان رشتہ دار، ٹائم پیس، کھانسی وغیرہ، افسانے نظام ہفتہ وار

کلکتہ و بمبئی (حال لاہور) میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ عرصہ تک ادارہ نظام سے بھی وابستہ رہے۔ مثنوی اور ڈرامے بھی لکھے۔ بنگلہ زبان بھی سیکھی ہفتہ وار عبرت، اور شعلہ کلکتہ انھیں کی سرپرستی میں جاری ہوئے۔ غزل، رباعی، قصیدہ مرثیہ، مسدس، مخمس، مستزاد، وغیرہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں، سب سے پہلا شعر جو موزوں کیا وہ یہ ہے ؎

چار سو عالم میں ہے چرچا رسول اللہ کا
پڑھ رہی ہیں بلبلیں کلمہ رسول اللہ کا

شروع میں خواجہ تابش فاروق احمد ساحری پھر ریاض خیرآبادی سے استفادہ کیا۔ ان کے بعد آرزو کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ کلام میں جہاں استاد کی پیروی کی ہے معلوم ہوتا ہے۔ آرزو بول رہے ہیں بایں ہمہ ان کا کلام جدید و قدیم رنگ کا نہایت حسین و لطیف امتزاج ہوتا ہے۔ طرز تحریر کا کچھ ایسا خاص رنگ ہے کہ ایک حلقہ میں ترقی پسند اور دوسرے میں رجعت پسند کے نام سے بدنام ہیں۔ آرزو کے رنگ میں چند اشعار سنیئے ؎

ساقی تیرے فیض کے صدقے جتنے پینے والے ہیں
ہوش کی باتیں سب کرتے ہیں کہنے کو متوالے ہیں
تیری گلی کی دھن میں جو نکلے اس کو اتنا ہوش کہاں
راہ میں کتنے کانٹے بچھے ہیں پاؤں میں کتنے چھالے ہیں

اس کے علاوہ ایک اور مخصوص رنگ ہے یعنی سیاسی ماحول کے تاثرات کو غزل کے سانچے میں اس طرح ڈھالنا کہ غزل پند نامہ نہ ہو جائے ملاحظہ فرمایئے ؎

منھ دیکھنے کا وقت نہیں، ڈوبتی ہے ناؤ
تم ناخدا بنو تو بہی جو خدا کرے
ہزار پہلو بھے جانچنے کے کہیں کھل جاتی اصلیت بھی
ہمیں تو اس حسن ظن نے مارا بھلا وہ ہم سے دغا کرینگے
چمن کی دنیا میں خاروخس کو ملیگا جب تک نہ حقِ فطرت
ہمیشہ بجلی گرا کرے گی ہمیشہ فتنے اٹھا کریں گے

جرم محمد آبادی کے محاسن کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے مستقل ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ لہذا مندرجۂ بالا اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

جرم، دبستان آرزو، کے بانی اور صدر ہیں۔ یہ وہ ادبی انجمن ہے جس کے تحت فن معلومات اور زبان و ادب کی تحقیق و اصلاح کا کام سرانجام پا رہا ہے۔

تلامذہ جرم کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نازش نام شہادت حسین، تخلص نازش، مقام ولادت سکندرپور۔ اوائل عمر سے کلکتہ میں قیام ہے ۱۹۲۹ء میں جرم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ طبیعت میں بلا کی روانی ہے ؎

شکست دل سے دنیا آشنائے راز ہوتی ہے
ادھر شیشہ کھنکتا ہے اُدھر آواز ہوتی ہے

سوز نام عبدالحق۔ عمر اٹھائیس سال ؎

یہ کہہ کر چارہ گر نے مار ڈالا
علاجِ اضطراب دل نہیں ہے

ان کے علاوہ گوہر محمد آبادی، تحر برآمدپوری بی اے، انجم اعظمی۔ رشید رامپوری، رشید مظفرپوری، ثمر خضرپوری، رشید بنارسی، خیر مظفرپوری

ممتاز گونڈوی، تیحر سہسرامی ۔ناز غازیپوری، شیدا خیرآبادی، شمیم خضرپوری، صبر خضرپوری، احسن دریاآبادی، اختر اعظمی، مظہر سلیم آبادی ایم۔اے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اور کلکتہ میں مقیم ہیں۔

پرتو سید اظہر حسین نقوی نام اور پرتو تخلص ہے۔ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء بمقام لکھنؤ ولادت ہوئی۔ آرزو کے ممتاز شاگردوں میں ہیں۔ چودہ سال کی عمر میں ایک صاحب کی زبانی آرزو کا ایک شعر سنا ؎

تمھاری نظر اللہ بچائے ڈالتی ہے پتھر میں لکیر
دل کا اشارہ جس کی طرف تھا بیچ سے چیکا جام وہی

اس شعر نے ایسا اثر کیا کہ فوراً آرزو کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ فن و زبان کے اکثر و بیشتر باریک و دقیق نکتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ فنِ عروض پر مہارت ہے۔ استاد کی زندگی ہی میں نہ صرف فارغ الاصلاح ہو گئے بلکہ ان کے اکثر شاگردوں کی اصلاح کا کام ان کے سپرد رہا۔

۱۹۴۱ء میں کلکتہ سے ایک ہفتہ وار جریدہ "نظام" زیرِ سرپرستی آرزو لکھنوی جاری ہوا تو اس کی ادارت انہیں کے سپرد ہوئی۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں جب جاپان نے کلکتہ پر بمباری کی تو نظام بمبئی منتقل ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ پرتو بھی بمبئی چلے گئے۔ وہاں فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ چنانچہ "بھائی جان" اور "شاہکار" نامی فلموں کے لئے منظر نگاری، مکالمہ نویسی، اور نغمہ نگاری کے فرائض انجام دیئے۔ ان تصویروں کا ادبی حصہ ملک بھر میں معیاری تسلیم کیا گیا۔

انداز بیان میں کہیں کہیں استاد کی روشِ خاص کی جھلک نظر آتی ہے۔ کلام فنی عیوب سے پاک اور ابتدائی دسوقیت سے بلند ہوتا ہے۔ طبعزاد قصیدوں میں بالعموم سخت زمینیں اختیار کی ہیں جنہیں پانی کی طرح بہا دیا ہے قدما کی

روش کیخلاف قصیدے کو مختصر کیا لیکن لوازمِ قصیدہ کی پوری پابندی کی۔ نمونۃً ایک قصیدے کی تمہید ملاحظہ ہو ؎

دل کا شیشہ غمِ دنیا سے نہ کیونکر ٹوٹے
عقل کے کوہ تک اس چوٹ سے اکثر ٹوٹے

باغِ عالم میں زوال آتا ہے اچھوں ہی پر
خار گلبن میں رہے اور گل تر ٹوٹے

کم سے کم جو ہے وہ بنتا ہے ارسطوئے زماں
قول سے جس کے فقط عزمِ سکندر ٹوٹے

دستِ تحقیق تو کوتاہ تعلّی ہے بلند
جتنے تارے تھے فلک کے سرِ بستر ٹوٹے

ارم

نام شہنشاہ حسین، تخلص ارؔم، آرزو کے ایسے شاگردوں میں ہیں جن پر انہیں ناز تھا۔ انگریزی اور فارسی میں ایم اے ہیں۔ حلیہ گفتگو اور ہر انداز شاعرانہ ہے، آجکل ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہیں۔ ایک غزل سنئیے ؎

جس طرف اب نگاہ ہوتی ہے — تیری ہی جلوہ گاہ ہوتی ہے
گریۂ بیکسی کا پرساں کون — ہاں شبِ غم گواہ ہوتی ہے
حسن کی ایک بے گناہ نظر — بانیٔ صد گناہ ہوتی ہے
غیر کے نقشِ پا کو کیوں دیکھیں — راہ پھر اپنی راہ ہوتی ہے
مسکرا دے کوئی جھٹک کر ہاتھ — یہ کشش بے پناہ ہوتی ہے

چوٹ دل کی ابھر رہی ہے آرم
پھر چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

نواب محمد رفیق نام، نواب تخلص وطن دہلی۔ سن پیدائش ۱۹۱۲ء کلکتہ میں پندرہ برس سے قیام ہے۔ کلام میں پختگی اور طبیعت میں روانی ہے۔ ادب اردو کی خدمت کے سلسلہ میں اپنی جائے قیام پر "اردو مجلس" کی بنیاد رکھی جس کے سرپرست علامہ آرزو اور وحشت تھے۔ شہر کے تمام چوٹی کے شعراء اس انجمن کے ممبر تھے۔ کلکتہ کی ادبی محفلوں میں انہیں ممتاز جگہ دی جاتی ہے طبیعت میں انکساری اور تواضع ہے مرنجان مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کا شمار کہنہ مشقوں میں ہوتا ہے ؎

سازِ حیات میں اگر سوز کی چاشنی نہیں
عشق کی اصطلاح میں موت ہے زندگی نہیں

یہاں تک حسن کے جلووں سے دل معمور ہو جائے
کرن جو پھوٹ کر نکلے چراغ طور ہو جائے

کتنے ارمانوں کا خوں تھا یہ نہ دیکھا ایک نے
چند قطرے سب نے دیکھے جو گرے تھے جام سے

جی چاہتا ہے توڑ کے ہر بندشِ مجاز
اپنی جبیں میں رکھ لوں ترے سنگِ در کو میں

مضطر لکھنوی، حفیظ گیاوی، وکی دہلوی ان کے قابلِ ذکر شاگرد ہیں۔

سراج نام سراج احمد، تخلص سراج، علی آباد ضلع سلطان پور اودھ سے کلکتہ آئے اور عمر کا زیادہ حصہ یہیں بسر ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۴ سال کی ہوگی۔

۳۴ء میں جرم محمد آبادی سے ملاقات ہوئی شعر و شاعری کا ذوق موصوف کی صحبتوں میں پیدا ہوا ہے۔ جرم کے شاگرد بھی ہیں اور دوست بھی

جرم نے بعد میں آرزو کے سپرد کر دیا۔ طبیعت میں رنگینی اور کلام میں پختگی ہے ۔

ہتھکڑی کھل کے نہ گر جائے تو میرا ذمہ
تم ذرا کہہ کے تو دیکھو کہ بہار آئی

اُسی زمانے سے لہرا رہا ہے شعلۂ عشق
وہ شمع، ڈھونڈ رہے تھے جب انجمن کیلئے

عشق کی تاریک راہوں کا اُجالا بن گئے
جذب کر کے یوں اُٹھے جلوے تری محفل سے ہم

ناوک سید محمد ناوک لکھنوی آرزو کے قدیم شاگردوں میں ہیں بنگال میں اردو ادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ قابل قدر ہے۔ عمر، ۲ سال، نوٹو گرافی کی تجارت کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی، پختگی اور برجستگی عمر کے لحاظ سے بدرجۂ اتم موجود ہے ۔

مصیبت اپنی تماشہ ہے اہلِ گلشن کو
کوئی بجھاتا نہیں آگ آشیانے کی

جانچ کر عشق کی کسوٹی پر آپ نے دل بنا دیا دل کو

مدبھری آنکھوں میں کونین ہوئے جاتے ہیں غرق
اب ہنسی روک سکے چھلکتے ہوئے پیمانے کی

فرشتے بھی آئیں تو جانے نہ پائیں
سلامت نکل کر تمہاری گلی سے

کلیم شبیر حسین نام، کلیم تخلص، فیض آباد کے دیہات سیبا کے رہنے

والے ہیں۔ کلکتہ میں عرصہ سے مستقل قیام ہے۔ عمر کوئی ۳۵-۴۰ کے درمیان ہے

سراپا عشق ہو جانے پہ دل محوِ فغاں کیوں ہو
جہاں شعلہ ہی شعلہ ہو وہاں پیدا دھواں کیوں ہو

بلا سے شیشہ ٹوٹا ان کا غصہ تو ہوا دھیما
یہی دل کام کا ہے جو کسی کے کام آ جائے

منیر دنیائے ادب میں منیر لکھنوی کے نام سے مشہور ہیں۔ بچپن سے آج تک کلکتہ میں قیام پذیر ہیں۔ آرزو لکھنوی کے خلفِ اصغر۔ عمر کوئی ۳۵ سال۔ نیو تھیٹرز کمپنی کلکتہ میں مکالمہ نویس ہیں۔ طبیعت میں بے پناہ موزونیت اور غضب کی روانی ہے ؎

رنگیں ہے شعلہ الفت کا یہ راز اٹھانا کیا جانے
جو آگ لگاتا پھرتا ہو وہ آگ بجھانا کیا جانے

الزامِ جفا، جھوٹی تہمت، خود حسن پرست ہے پروانہ
معصوم ہے نطرت شعلے کی وہ غریب جلانا کیا جانے

بس چنگ و رباب کو چھیڑا کرے اور میٹھے سروں میں ڈوبا رہے
جو عیش کا نغمہ گاتا ہو وہ غم کا ترانہ کیا جانے

لائق مطیع الرحمن لائق دہلوی، نواب دہلوی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آرزو سے اکتسابِ فن کیا۔

کیا قہر ہیں نظامِ محبت کی بندشیں
دل میں ہو راز اور زباں رازداں نہ ہو

ان کے علاوہ ابراہیم ہوش، انجم کلکتوی مرحوم اور طور سہسرامی مرحوم بھی انکے مشہور شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اوّل ثانی الذکر کے تذکرے "عصرِ حاضر" کے باب میں شریک اشاعت ہیں۔ آخر الذکر کے سوانح و کلام عدم دستیابی کے باعث پیش نہ کئے جا سکے۔

بنگال کے ہندو ادیب

تمہید تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں بسنے والی قوموں کے میل جول اور ربط و ارتباط سے اردو زبان کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کی گود میں پروان چڑھی۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کی ملکیت ہے نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ اس کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت میں دونوں بڑی قوموں کا مساوی حصہ رہا ہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد، رسم و رواج، اور مذاہب و عقائد کے موضوعات کو مرکز فکر قرار دے کر جس خلوص، احترام و محبت کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے وہ قابل رشک اور ایک دوسرے کے دیرینہ تعلقات کا آئینہ دار ہے۔ ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور فروری ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر تاراچند

اپنے ایک مقالہ میں رقمطراز ہیں ۔

"انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اردو کو خالص اپنی زبان مانتے تھے۔ ہندو شعراء اور نثر لکھنے والے اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے تھے۔"

زبان اردو میں ہندوؤں کی خدمات کی داستانیں، متعدد عنوانات سے رسائل وجرائد و اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں ہندو اہل قلم کے تذکرے بھی مختلف کتابوں[1] کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مقام افسوس ہے کہ سرزمین بنگال میں ہندوؤں نے اردو ادب کی جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ادب اردو میں ان کا تذکرہ خال خال ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے۔ چنانچہ میر عطا حسین تحسین، میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، میر بہادر حسینی، کاظم علی جوان وغیرہ کے دوش بدوش بعض قابل قدر ہندو ادیبوں اور شاعروں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں ۔

نہال چند

لاہور کے رہنے والے تھے ۱۲۱۷ھ میں کلکتہ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ۱۸۱۴ء میں 'تاج الملوک' اور گل بکاؤلی' کی داستانِ عشق کو سب سے پہلے نثر میں موسوم بہ 'مذہب عشق' پیش کیا۔ گل بکاؤلی اصل میں شیخ عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کہانی اسقدر مقبول ہوئی کہ کئی بار ڈراموں کی شکل میں اسٹیج اور اسکرین کے ذریعہ خراج تحسین حاصل کر چکی ہے کئی زبانوں میں اس قصہ کا ترجمہ بھی ہوا۔ ایمان نامی شخص نے گلگشت کے نام

---

[1] ناظم سیوہاروی کی ایک کتاب "اردو زبان اور ہندو" راقم الحروف کی نظر سے گذری جس میں دو چار بنگالی ہندو ادیبوں کے تذکرے ملتے ہیں۔

سے اس کا اردو منظوم، ترجمہ اردو مثنوی میں تحفۃ المجالس کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس سے بھی قبل ۱۰۳۶ھ کی دکنی زبان میں اس کا نسخہ ملتا ہے۔

نمونۂ نثر:-

"اشرف البلاد کلکتہ میں آب دخورش کھینچ کر لائی اور یہ خاکسار کپتان وارٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ اُن کی دستگیری سے صاحب گلگرائسٹ بہادر مدظلہ کے دامن دوست تک دسترس پایا۔"

بینی نرائن نام بینی نرائن اور تخلص جہاںؔ، "دیوانِ جہان" کے مصنف ۱۸۱۲ء میں کپتان روبک سکریٹری فورٹ ولیم کالج کے حکم سے اپنے عہد کے ہندوستانی شعراء کا ایک تذکرہ لکھا۔ ایک فارسی قصہ کا ترجمہ موسوم بہ "چار گلشن" کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کا ذکر ہے ۱۸۱۱ء میں جب کپتان ٹیلر نے اسے دیکھا تو بہت پسند کیا اور انعام عطا کیا۔ گارساں دی تاسی کی تحقیق ہے کہ انھوں نے شاہ رفیع الدین کی "تنبیہہ الغافلین" کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا۔ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد بریلوی سے بیعت کر لی تھی[۵۱]

سری لال گجراتی نے پرانی بھاشا کو اردو کے نئے روپ میں پیش کیا۔ بے شمار کتابیں اردو میں لکھیں۔ پریم ساگر، مراج منتی، لطائف ہندی، کشن جی، وغیرہ کو اردو ادب سے روشناس کرانے کا سہرا انھیں کے سر ہے[۵۲]

لالہ سداسکھ لال کی ایک کتاب "مجموعۂ قوانین"، ۱۸۳۴ء میں اور

---

۵۱ تاریخِ ادب اردو صفحہ ۱۴ ضمیمہ   ۵۲ گلِ رعنا

دو سری "گنگا کی لہر" ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے چھپکر شائع ہوئیں۔ اول الذکر ان کی تالیف ہے اور آخر الذکر انگریزی زبان سے ترجمہ جو علم زراعت سے متعلق ایک انگریز نے لکھی تھی۔

ہیمتم چندر نے ۱۸۳۶ء میں گل صنوبر کو اردو لباس سے آراستہ کیا، متذکرہ بالا ادیبوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے ہندو اہل علم وقلم کی فہرست حسب ذیل ہے:-

نام مصنف	تصنیف	سن اشاعت	نام مصنف	تصنیف	سن اشاعت
لالہ دھرم نرائن	اصولِ انتظامِ مدن	۱۸۴۶ء	سیتل پرشاد	مراۃ العلوم	۱۸۴۷ء
کالی رائے	کھیت کرم (فنِ زراعت سے متعلق)	"	ہری دامن لعل	علم طبیعات	۱۸۴۹ء
			پنڈت موتی لال	پندنامہ کاشتکاری	۱۸۵۲ء
پنڈت رامچندر	اصولِ علم ہیئت قانون الطباع	۱۸۴۷ء	منی بھولا ناتھ	خلاصۃ النصائح	۱۸۵۴ء
			دیوی پرشاد	قواعد اُردو	؟
روپ نرائن	جغرافیۂ ہند	؟			

نبو کرشنا مہاراجہ نبو کرشنا دیب (بہادر) ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں میں تھے۔ لارڈ کلایو کے دیوان اور وارن ہسٹنگز کے میر منشی تھے۔ آخری عمر میں شاہی دربار سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ اپنے زمانے کے بہت مشہور ادیب اور پُرگو شاعر تھے۔ ان کی اولاد میں کئی نامی گرامی شاعر گذرے ہیں۔

راج کرشنا مہاراجہ راج کرشنا دیب (بہادر) تخلص راجؔ کرتے تھے مہاراجہ نبو کرشنا دیب کے خلف اکبر تھے۔ باپ کی طرح

وہ شاہی دربار سے منسلک رہے فارسی اور اردو میں اچھی استعداد تھی۔ شعر و شاعری کا ستھرا
مذاق رکھتے تھے۔ نیش کے شاگرد تھے۔ معظم شاہ کی توصیف اردو میں ایک نظم لکھی تھی جو اتنی مقبول
ہوئی کہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، پیرس کے سرکاری
کتب خانہ اور برلن یونیورسٹی لائبریری کی زینت بنی۔ نظموں کے علاوہ غزلوں کا سرمایہ
بھی اچھا خاصا ہے۔ ان کی کلیات پانچ جلدوں میں چھپی۔ ان کا یہ شعر زبان زد عام ہے

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب
تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

کنور

نام راجہ اپرد پ کالی کرشنا تخلص کنور۔ سن پیدائش ۱۸۰۷ء
راجہ راج کرشنا دیب کے بیٹے تھے۔ اپنے خاندان کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے
انگریزی ادب پاروں کو اردو کا جامہ پہنایا چنانچہ مشہور شاعر "گے" (GAY)
کی کہانیوں FABRADE GAY کا ترجمہ اردو زبان میں "حسن المواعظ"
کے نام سے کیا۔ مسلمان بادشاہان ہند کا "شاہنامہ" ان کا غیر فانی و قابل قدر کارنامہ
ہے۔ متعدد تالیفات و تصنیفات انکی یادگار ہیں۔ ایک دیوان اور ایک تالیف
"مجموعۂ لطائف اردو" مشہور ہیں۔ زبان اردو کی نشر و اشاعت کی غرض سے ایک
ہفت روزہ رسالہ "نظام شمسی" ۱۸۳۰ء میں جاری کیا تھا۔

شفق

راجہ جادب کرشنا دیب تخلص شفق راج خاندان کے مشہور شاعر،
عبدالغفور خاں نساخ کے ہمعصر اور محزوں کے شاگرد عزیز تھے۔ شفق
کے دو شعر ہیں ؎

خفتگان خاک ہیں قربان اسی رفتار پر
ہی قیامت کا گماں سب کو قد دلدار پر

نیند تو آتی نہیں جو خواب میں دیکھوں اسے
حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

کشن

بابو کرشنا چندر گھوش کشن مہاراجہ تنو کرشنا دیب کے ناتیوں میں اچھے شاعر تھے۔

ارمان

راجہ جنجوئی منزا ارمان چوربگان کلکتہ کے راجہ فیملی کے چشم و چراغ تھے۔ شرف تلمذ ضیغم سے تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے گرے کی نظموں کا اردو ترجمہ کیا۔ صاحب دیوان تھے۔ ان کا یہ مقطع بہت مشہور ہے

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جاں نکلا
تن سے جاں نکلی مگر دل سے نہ ارماں نکلا

شعرائے اردو کا ایک تذکرہ موسوم بہ نسخۂ دلکشا ' ان کی ادبی شخصیت کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی تھی گارساں دی تاسی کی غیر فانی کتاب "تاریخ ادبیات ہندوستانی" کی دو جلدیں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں اور آخری جلد بھی مطبع کو بھیجدی گئی تھی۔ اگر ارمان کا 'نسخۂ دلکشا' اس سے قبل شائع ہو چکا ہوتا تو دتاسی یقیناً اپنی کتاب میں اور بعض نئی اور مفید چیزوں کا اضافہ کر سکتا تھا لیکن بہر حال دتاسی نے اتنا ضرور کیا کہ بطور ضمیمہ ان تمام شعراء کی فہرست جن کا حال اس تذکرے میں ہے داخل کتاب کر دی۔ یہ فہرست صفحہ ۳۵۵ سے صفحہ ۳۷۶ تک پھیلی ہوئی ہے "تاریخ ادبیات ہندوستانی" کی آخری جلد شائع ہونے پائی تھی کہ ارمان کا انتقال ہو گیا۔ بابو راجندر لال مترجو ارمان کے رشتہ دار تھے ادیبانہ مذاق رکھتے تھے انھوں نے ارمان کی دوسری جلد کا غیر مطبوعہ نسخہ دتاسی کے پاس بھیجدیا جس کا تعارف دتاسی نے اپنی کتاب کی جلد ثالث کے دیباچہ میں کر رہا ہے۔[۵۱]

---

۵۱ نسخہ دلکشا اور دتاسی '، از عبدالودود بیرسٹرایٹ لا مطبوعہ جدید اردو ستمبر ۱۹۴۱ء

ملک کلکتہ کے دوسرے کئی ہندو خاندانوں میں شاعروں نے جنم لیا ان میں ملک خاندان ساکن جوڑا سانکھو کے جگناتھ پرشاد ملک (تخلص بھی ملک تھا) نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ملک باسط علی محوی کے تلمیذ تھے۔

راؤ کانت راجہ راؤ کانت دیو بہادر، راجہ کالی کرشنا بہادر کے ہمعصر تھے اپنے عہد کے ہردلعزیز لیڈر، مشہور مصنف اور زبردست اردو داں تھے ایک ضخیم لغت جو سنسکرت اور ہندوستانی زبان میں ہے۔ کے علاوہ فاضل دسی کتابیں بھی ان کی تصانیف ہیں۔ ان کی قابلیت اور ہردلعزیزی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ۱۶ اپریل ۱۸۶۲ء میں بنگال کے گورنر سر جے۔ بی۔ گرانٹ کی واپسی کے موقع پر بحیثیت صدر جلسہ انھوں نے نہایت پرمغز اور عالمانہ تقریر کی تھی۔ یہ تقریر اردو، بنگلہ اور انگریزی اخباروں میں چھپی اور بنگال سے لیکر یورپ تک خراج تحسین حاصل کی۔ اس جلسہ میں راجہ کالی کرشنا بہادر بھی شریک تھے۔ یہ تقریر کتابی شکل میں رائل ایشیائٹک سوسائٹی لندن اور کلکتہ میں موجود ہے۔ (خطبات گارسان دی تاسی)

آگہ نام پنڈت جوالا ناتھ۔ تخلص آگہ۔ باپ کا نام دانارام برہمن کلکتہ کے باشندے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

جان جاتی ہے تڑپتا ہوں پڑا

دیکھئے کیا ہو تماشا کیا ہے

رام موہن راجہ رام موہن رائے فرقہ برہمو سماج کے بانی اور اٹھارویں صدی کے مجددین میں سے تھے۔ بنگلہ اور انگریزی کی کئی کتابیں لکھیں۔ پیرس میں

سومیو گارسان دی تاسی سے بھی ان کی ملاقات رہی اور رسم و راہ اتنی بڑھی کہ ۱۸۵۳ء میں کلکتہ واپس آکر اردو میں خط و کتابت کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ایک اردو اور ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔

طرب جھنولال طرب اچھے مرثیہ گو تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے متمنی و خواہشمند دونوں قوموں کے رسم و رواج، معاشرت و تمدن، اور بزرگانِ مذاہب سے متعلق بے شمار مرثیے لکھے۔ حضرت کبریٰ اور حضرت قاسمؑ کے حال پر آنسو بہاتی ہیں۔ کتنا دلسوز منظر ہے ؎

آخر بعیتوں نے جا نہاتی ہیں ملائی اسکی — کاٹی پہونچی کاہی ہو ہر اک کلائی اس کی
گھوڑے سے گرا اور گھر میں آواز جو آئی اسکی — یوں رونا لاش پہ اسکی فرزند پیمبر آیا

قاسم دلہن کو تیرے ٹھور ہو نہ ٹھاؤں
ہاتے میں یوں مل گیو بر حسن کے ناؤں

گھوڑے پر لاشہ رکھ کر اس زخمی تیغ و سنانکا — خیمہ کیجانب اور وہ شبیر نے گھوڑا ہانکا
سو ہر چیخ لی سو اس دم نبری نے منہ اپنا ڈھانکا — دولہا کا لاشہ جس دم خیمہ کے اندر آیا

ہاتھ کی چوڑی پھوڑ کے نوچے اسے میلے کیس
منہ کو دھول لپیٹ کے کیا فقیری بھیس

آج سے آٹھ دس سال قبل کلکتہ کے ایک بڑے علمی ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک نہایت معیاری انگریزی جریدہ "مسلم ریویو" شائع ہوتا تھا ہر قسم کے معیاری مضامین کے علاوہ ہند، ایران و عرب کے قدیم و جدید شعراء و ادباء کے تذکرے بھی اکثر شائع ہوتے۔ اس کی فائلیں دیکھنے سے بنگال کے کئی اردو اور فارسی شعراء کا بھی انکشاف ہوتا ہے بعض کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے

منتھرا داس شاہ جہاں کے عہد کا بہت بڑا فارسی گو شاعر تھا۔ نثر و نظم کا

مجموعہ "منتھر الامرا" اس کی شاعرانہ عظمت اور ادیبانہ صلاحیت کا مظہر ہے۔ جب گورنر بنگال خان زماں نے انھیں قید کر دیا تو انھوں نے فارسی میں ایک نظم کہی جو اتنی پسند کی گئی کہ فوراً رہا کر دیئے گئے۔ اس نظم میں EMPERIAL CITY کے نام کا پیغام تھا جو حکیم رکن کاشی کی معرفت بھیجا گیا تھا۔

پروانہ

جسونت سنگھ پروانہ نواب شجاع الدولہ (بنگال) کے دربار سے منسلک تھے ؎

ترپتے جو دیکھیں ہیں لاشیں تو دل اب
ترے کوچہ کو کربلا جانتا ہے

دل

نام دیبی پرشاد۔ تخلص دلؔ۔ مرشد آباد کے رہنے والے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی ؎

امید وصل اس سے محبت تو رکھے ہے دل
جس سے کہ رسم نامہ و پیغام بھی نہ ہو

راجہ

بینی بہادر راجہ متوطن بنگال۔ تاریخ وفات سنہ ۱۱۷۳ھ مطابق سنہ ۱۷۶۰ء یہ بھی شاہ عالم کے زمانے میں دلی آ گئے تھے اور درباری شاعروں میں درجۂ امتیاز حاصل تھا ؎

سیاہی مُو کی گئی دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

موزوں

نام مہاراجہ رام نرائن۔ تخلص موزوںؔ۔ مرشد آباد کے باشندے

شیخ علی حزیں کے زمرۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ نواب سراج الدولہ کے دامنِ دولت سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام ؎

ابر ہوگا تو خجالت سنتی پانی پانی
مت مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے سنگ

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

عصرِ حاضر کے ہندو شعراء میں منی لال جواںؔ، شیدا تلمیذ مرحوم محمد آبادی مایا لال دردؔ آصفی، مدن لال آزاد، بیدلؔ آصفی، لکشمی نرائن مونسؔ آصفی آزادؔ، وحشی مظہری۔ شاگرد خورشید حسین کاوش و رنگینؔ آج بھی اپنے اپنے طور پر اردو زبان وادب کی خدمت میں معروف ہیں۔ گو سب کا وطن بنگال نہیں لیکن مدت سے وہاں سکونت پذیر ہیں۔ سرزمین بنگال میں اپنی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذار رہے ہیں۔

جواں

مندرجہ بالا شعراء میں منی لال جواںؔ سب سے زیادہ کہنہ مشق اور رفادر الکلام شاعر ہیں۔ عمر تقریباً ۵۵ - ۶۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ کلکتہ میں تیس سال سے مقیم ہیں۔ آرزوؔ لکھنوی جیسے یکتائے روزگار استاد سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ کلکتہ کی دنیائے شاعری میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ہفتہ وار نظام، جدید اردو کلکتہ اور دیگر اخبارات ورسائل میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود انھیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

یہ خونِ دل منتقل ہوا ہے پسینے سے تر جبیں نہیں ہے
بدل کے کروٹ بہا ہی دریا کہیں ہے پانی کہیں نہیں ہے

سرفروشانِ محبت باز آ سکتے نہیں
رد کیا ہوگا انھیں کو ہاتھ قتلِ عام سے

پامالِ غم ازل سے دلِ ناصبور ہے
اک آئینہ ہے پاس مگر چور چور ہے

امتحاں پردہ نگاہِ ناز جب حائل ہوئی — کائناتِ دو جہاں سمٹ سمٹ کر دل ہوئی
آبِ کھتا ہی تو کیا جب کام آسکتا نہیں — تشنہ لب کی پیاس آئینہ بجھا سکتا نہیں
کس طرح کشتی امید و بیم کی حد سے بڑھے — جتنی دھارے میں کشتی ہے اتنی ہی ساحل میں ہے

جانے جانے لیجائیے دیدار کا جام
پینے والا نہ رہا جب تو دوا کیا ہوگی

جواں کا مجموعۂ کلام غیر مطبوعہ ہے۔ ان کے چشمۂ فیض سے جو جواں سال شعراء فیضیاب ہوئے اُن میں شیدا، کامل، عشرت، رحیم قابل ذکر ہیں۔

افسوس کہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ بنگال کا بھی بٹوارہ ہو گیا لیکن اردو زبان وادب کا اس تقسیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کے حسبِ ذیل الفاظ نہ صرف قابل احترام بلکہ تاریخ اردو ادب میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

"اردو ہندو مسلمانوں کو اپنے آباد اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔"[۵]

۵؎ ہماری زبان دہلی۔ یکم مئی ۱۹۴۵ء

بنگال کی اہلِ قلم خواتین

تمہید | بنگال میں اردو کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت کے سلسلہ میں صرف اربابِ علم و فضل ہی نہیں بلکہ طبقۂ نسواں کا بھی قابلِ قدر حصہ رہا ہے۔ ان کی خدمات بھی کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ یوں تو چند صدی پیشتر مرشد آباد اور ڈھاکہ کے نواب خاندانوں میں بہت سی نامور ادیبہ اور خوش فکر شاعرہ گذری ہیں لیکن ان کی شاعری یا انشا پردازی کوئی افادی حیثیت نہیں رکھتی ان کے ہاں کوئی مستقل تصنیف یا کلام کا مکمل مجموعہ نہیں ملتا۔

لیکن انیسویں صدی سے آجتک بنگال نے جو اہلِ قلم خواتین پیدا کیں ان کا نام دنیائے ادب میں فخر و مباہات سے لیا جا سکتا ہے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں

اور کلام کا گرانقدر سرمایہ ہند و پاک کی مشہور اہل قلم خواتین کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

شرف النساء ایسی خواتین میں انیسویں صدی کے اوّل نصف دور میں ایک خاتون کا پتہ چلتا ہے جن کا نام شرف النساء ہے وہ مرشد آباد کے نواب ناظموں کے دربار سے وابستہ تھیں۔ ان کی ایک عدیم المثال قلمی اردو مثنوی[۱] پروفیسر محفوظ الحق ایم اے مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ مثنوی چار ہزار اشعار اور ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مؤلفہ کے حالات دستیاب نہ ہو سکے ان کا نام حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوا ؎

پڑی ہیگی غلطی میں شرف النساء ۔۔۔ نظر تجھ کو ابتک نہ آیا خدا
خدا سے یہی ہے اسے التجا ۔۔۔ جو عاجز تیری ہے شرف النساء
تو کر دے سخن کو مرے سربلند ۔۔۔ سخن ہوئے میرا جہاں کو پسند

مثنوی میں نواب فریدوں خاں کی ماں (رئیس النساء بیگم) اور خود نواب کی تعریف بھی مستقل باب ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی نواب فریدوں جاہ اور رئیس النساء بیگم کی حیات میں تالیف ہوئی۔ نواب فریدوں جاہ ۱۸۳۶ء میں مرشد آباد کی مسند پر بیٹھے اور ۱۸۸۰ء تک حکمراں رہے۔ اس لئے یہ مثنوی انہیں دو سنوں کے درمیان لکھی گئی ہے۔

مؤلفہ اثنا عشری شیعہ ہیں۔ دوازدہ امام کی منقبت بڑے زور و شور سے لکھی ہے۔ حضرت علیؑ کی منقبت میں کہتی ہیں ؎

---

[۱] راقم الحروف نے اسی نسخے اور پروفیسر محفوظ الحق مرحوم کے ایک مقالہ سے استفادہ کیا ہے۔

خدا کے پیارے محمدؐ کے یار — علی مرتضےٰ شاہ دُلدل سوار
ہوئی رحمتِ حق سب ان پر تمام — خدا کے ولی اور ہمارے امام
یہ امت نہ ہو شاد کیونکر تمام — کہ ہوں پیشوا جن کے ایسے امام
خدا کا ہے ان پر درود و سلام — ہوا پنجتن پاک جن کا کہ نام

مثنوی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلفہ نواب فریدوں جان کے محل میں ایک کنیز کی حیثیت رکھتی تھیں۔

پھریگا یہ قصہ جو شہر و دیار — اور سمجھیں گے سب احمق و ہوشیار
کہیں گے یہ ہے پھر تو اہلِ تمیز — کہ خاوند تھے ایسے، ہے، ایسی کنیز

ایک جگہ نواب فریدوں جاہ کو "آقا" کے نام سے یاد کرتی ہیں۔

کہ نظم و نثر میں نہیں مجھ کو ڈھنگ — مگر میرے "آقا" جو ہیں صوبہ جنگ

شرف النساء کا انداز بیان صاف، سادہ اور سلیس ہے روانی بھی ہے لیکن زبان کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔ عربی الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ جس طرح بولتی ہیں ویسا ہی لکھ دیتی ہیں بعض تشبیہیں نئی اور بہت اچھی ہیں کہیں کہیں زنانہ محاورات بھی آجاتے ہیں بعض جگہ فارسی کے اشعار بھی آگئے ہیں۔ مثلاً جس جگہ اپنی خامیوں کا ذکر کرتی اور پڑھنے والوں سے معذرت کی طالب ہوتی ہیں تو کہتی ہیں۔

کہیں جبکہ سعدی سے دانش گزیں — بساطِ سخن پردہ بالانشیں
تو گر پر نیانی بیدا مکوش — کرم کار فرما و حشوم بپوش
تو پھر اس جگہ ہے زباں میری بند — کریں اپنے الطاف دانش پسند

بہر حال مثنوی کے مصائب و محاسن کے متعلق بقول پروفیسر محفوظ الحق اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ وہ ایک عورت کی تالیف ہے،

اور بنگالہ میں لکھی گئی ہے۔ لہذا خاص توجہ اور ستائش کی مستحق ہے۔

خجستہ اختر کلکتہ کے سہروردی خاندان میں تعلیم و تربیت کا بہت اعلیٰ معیار رہا ہے اس خاندان نے مولانا عبیداللہ[1] عبیدی جیسے بلند پایہ شاعر، حسین شہید سہروردی جیسے شہرۂ آفاق مدبر سیاست داں، بلکہ کئی خوش فکر شاعرات اور ممتاز ادیبوں کو بھی جنم دیا جن میں خجستہ اختر بانو سہروردی اور شائستہ اختر سہروردی غیر فانی شہرت کی مالک ہیں۔ ان کے اکثر جواہر پارے دونوں مملکتوں کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر ارباب ادب سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔

خجستہ اختر بانو مولانا عبیداللہ عبیدی کی دختر نیک اختر، سر زاہد سہروردی مرحوم کی اہلیہ محترمہ، حسن شاہد سہروردی اور حسین شہید سہروردی، سابق وزیر اعظم متحدہ بنگال اور موجودہ وزیر قانون حکومت پاکستان کی والدہ ماجدہ ڈاکٹر سر حسان سہروردی مرحوم اور سر عبداللہ سہروردی مرحوم کی ہمشیرہ تھیں مولانا راشد الخیری مرحوم و مغفور کی مشہور تصانیف غم زندگی و صبح زندگی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ خجستہ اختر کے زیر مطالعہ رہیں شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم سے زیادہ متاثر تھیں۔ خجستہ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں ان میں کوکب دری اور "آئینہ عبرت" خاص طور پر قابل ذکر ہیں کوکب دری میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی، عرب کے زمانۂ جاہلیت کے واقعات اور میلاد النبی کے موقع پر پند و نصیحت کی مثالیں جس

---

[1] مولانا عبیداللہ عبیدی فارسی، اردو عربی زبانوں کے نہایت اچھے شاعر، اردو اور فارسی کے صاحب دیوان اور مفتاح الادب" مطبوعہ مفید عام پریس لاہور کے مصنف تھے، بنگال میں عبدالغفور نساخ کے ہمعصر تھے۔

دل پذیر اور دل کش انداز میں قلمبند کی گئی ہیں وہ نہایت سبق آموز اور معلومات افزا ہیں فارسی اور اردو اشعار کے برمحل استعمال نے قارئین کی دلچسپی میں دو چند اضافہ کردیا ہے۔ میلاد کی ایسی جامع و نافع کتاب آجتک شائع نہیں ہوئی علامہ وحشت کلکتوی آرزو لکھنوی مرحوم، ناطق لکھنوی مرحوم جیسے اہل نظر اور اساتذۂ فن نے اس کتاب کی تصنیف پر تحسین آمیز کلمات لکھے ہیں۔

خجستہ اختر کی دوسری کتاب "آئینۂ عبرت" نہایت شستہ و سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ دونوں آجتک کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں اور وہاں کے ہر کتب خانے میں دستیاب ہیں۔

شائستہ اختر

خجستہ اختر کی بھتیجی، سر حسان سہروردی مرحوم کی صاحبزادی اور پیرس کے سفیر پاکستان جناب اکرام اللہ صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

شائستہ اختر کا سن پیدائش ۱۹۲۵ء بمقام کلکتہ ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کی ایم۔ اے اور لندن یونیورسٹی کی پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو میں) ہیں۔ اردو اور انگریزی ادب سے اوائل عمری سے دلچسپی رہی اور دونوں زبانوں میں لکھنے کی یکساں قدرت رکھتی ہیں۔ چنانچہ انگریزی جرائد مثلاً کلکتہ سول اینڈ ملٹری گزٹ، ڈان کراچی، اسٹیٹسمین کلکتہ۔ ہندوستان ٹائمز کلکتہ وغیرہ اور اردو رسائل زیب النساء لاہور، حریم، لکھنؤ، تہذیب نسواں ہمایوں لاہور، عصمت دہلی وغیرہ میں ان کے شہ پارے اکثر شائع ہوتے رہے ہیں، "کوشش ناتمام" کے نام سے ایک افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

انھوں نے علمی و ادبی مقالات کے علاوہ سیاستِ حاضرہ کے متعلق

بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ جو شائستہ اختر اور خجستہ اختر، راحت آرا بیگم بنگال کی چند ایسی باوقار اور قابلِ قدر خواتین میں سے ہیں جن کی خدمات رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جا سکتیں اور جن کی ذات پر بنگال کو ناز ہے اور بجا طور پر ناز ہے۔

رئیسی بیگم مولوی فضل الحق کی صاحبزادی ہیں۔ خوش فکر شاعرہ اور بڑی اچھی انشاء پرداز ہیں۔ شائستہ اختر کی خالہ زاد بہن ہیں۔

صحیفہ بانو یادگارِ صحیفہ، مطبوعہ رزاقیہ پریس مدراس ۱۳۳۲ھ کی مصنفہ سلہٹ کی رہنے والی تھیں۔ شرفِ حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکی تھیں بڑی متقی اور صوم و صلوٰۃ کی پابند بلند نفس خاتون تھیں شعر بھی کہتی تھیں اور نثر بھی لکھتی تھیں اور دونوں پر قادر تھیں۔

راحت آرا راحت آرا بیگم[۵۱] خان بہادر محمد سراج الاسلام ایم۔ اے۔ ایل۔ بنگال سول سروس کی اہلیہ محترمہ اور شمس العلماء کمال الدین احمد ایم۔ اے، آئی، ای، ایس کی صاحبزادی شمس العلماء ذوالفقار علی کی پوتی اور نواب بہادر عبداللطیف برادرِ حقیقی عبدالغفور خاں نساخ کی نواسی تھیں۔ سنِ پیدائش بمقام کلکتہ ستمبر ۱۹۱۰ء۔ وفات ۲۱ اپریل ۱۹۴۹ء کلکتہ کی مشہور افسانہ نگار اور ممتاز ادیب تھیں۔ ان کا طرزِ تحریر عجیب دلکش اور دلآویز تھا اس کے متعلق سر شیخ بہادر کی رائے ہے۔

"اردو ادب میں یہی طرز رائج ہو جائیگا"۔

افسانوں کے مجموعے پریمی بانسری کی آواز، شب کی پکار، بدنامی کی بہی(؟) دلنواز، انقلاب، غنچۂ افسانہ کے نام سے شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے مضامین کی تعداد پچاس سے زائد ہیں۔ حسبِ ذیل رسائل میں عموماً ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔

---

[۵۱] ماخوذ از بنگلہ کتاب (منقلہ کیجئے جا چھے) مصنفہ محبوب العالم۔ মহিলা কেভে সমতনে

سہیل، عصمت، نیرنگ خیال، تہذیب نسواں وغیرہ۔ ٹیگور کا افسانہ، ڈاک گھر کا بنگالی زبان سے براہِ راست ترجمہ کیا۔ مجموعۂ کلام دیوان راحت اور ناٹک رادھا کے نام سے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

حسن زہرہ

حسن زہرہ صاحبہ جو ڈھاکہ میں بیگم لقمان حیدر کے نام سے مشہور ہیں اس ادب نواز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس نے اردو ادب کو سجاد حیدر یلدرم جیسا ممتاز ادیب اور قرۃ العین حیدر جیسی مشہور افسانہ نگار بخشی۔ سجاد حیدر یلدرم آپ کے چچا اور قرۃ العین حیدر صاحبہ آپکی چچازاد بہن ہیں۔ آپ کے والد سید نثار حیدر زیدی جو خود بھی ایک اچھے نثر گو ہیں اور قتیل تخلص فرماتے ہیں ایک مدت تک یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور اب ریٹائر ہونے کے بعد مستقل طور سے علی گڑھ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ ویسے ان کا وطن "نہٹور" ضلع بجنور (یو۔ پی) ہے۔

حسن زہرہ صاحبہ جون ۱۹۱۷ء میں پرتاب گڈھ یو۔ پی میں پیدا ہوئیں ۱۹۳۷ء میں علی گڈھ سے بی۔ اے کیا۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں اپنے شریک حیات سید لقمان حیدر صاحب منیجر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ہمراہ کراچی پھر لاہور اور اس کے بعد ڈھاکہ تشریف لائیں۔

بیگم حیدر فطرتاً خلیق، متواضع اور ایک بلند کردار کی مالک ہیں۔ ان کے مزاج میں رعونت یا احساسِ برتری نام کو نہیں۔ ان کے دولتکدے پر جہاں شہر کے عمائدین و افسران تشریف لاتے رہتے ہیں وہیں وہ ادیب بھی بلا کسی روک ٹوک باریاب ہوتے ہیں جن کے پاس ظاہری نمود و نمائش کے اسباب نہیں۔ لیکن بیگم حیدر دونوں صورتوں میں ایک ہی انداز سے خوش آمدید کہیں گی۔ ان کی وسیع النظری اور خلوص

میں کسی قسم کے امتیاز کا شائبہ نہ ہوگا۔

انگریزی اور اردو ادب پران کا مطالعہ وسیع ہے۔ ادبی تحریکوں کے علاوہ وہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی آنریری جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ ڈھاکہ میں بیگم صاحبہ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت اور ترویج و ترقی میں پیش پیش ہیں وہاں کی ادبی دنیا میں ان کی وجہ سے کافی گھما گھمی رہتی ہے۔

انھیں شعر کہتے ہوئے چھ سات سال سے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔ لاہور کے دورانِ قیام میں چند غزلیں احسان دانش کو دکھائیں۔ اور اب ڈھاکہ میں علامہ حضرت رضا علی وحشت سے اصلاح لینا شروع کی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں مگر فطری مناسبت غزل سے ہے۔ متقدمین میں ان کے پسندیدہ شعراء میر اور مومن ہیں۔ زمانہ حال کے شعراء میں جگر، فیض، اور مجاز کے کلام سے متاثر ہیں۔

ذیل میں انکے چند اشعار بطور مشتے از نمونہ خروارے پیش کئے جاتے ہیں جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ؎

اکثر وہ اشک جو مری آنکھوں سے بہہ گئے
سوزِ نہاں کا راز زمانے سے کہہ گئے

آئینِ گلستاں کیا تجھ کو اے بادِ صبا معلوم نہیں
غنچوں کو پریشاں کرنے سے خود گلشن کی رسوائی ہے

ہم تو قفس میں بند ہیں آشیاں سے دور
ڈھونڈا کریں چمن میں ہمیں دن بہار کے

جفا ہی کیوں نہ ہو آخر وہ غافل تو نہیں ہم سے
خدا کا شکر ہے ہم کو وہ اس قابل سمجھتے ہیں

اے کاش گلستاں سے ہم کو اتنی ہی شکایت ہے ہمدم
تخریبِ گلستاں یاد رہی تعمیرِ گلستاں بھول گئے

بیگم شادانی

ایم-اے-ڈی-ٹی (آکسن) کا تعلق گو بریلی (یو-پی) سے ہے لیکن عرصہ دراز سے ڈھاکہ میں مقیم ہیں- انگریزی اردو، فارسی زبانوں پر کامل قدرت رکھتی ہیں اس کے کئی زبانوں سے ترجمے اور افسانے ماہنامہ خاور ڈھاکہ اور دیگر رسالوں کی زینت بنتے رہتے ہیں- ان کی خاموش خدمات قابل قدر ہیں- آجکل میری کالا کو کراچی کی پرنسپل ہیں-

زینب نعمانی تسنیم

اردو ادب میں ایسی شاعرات کی بہت کمی ہے جو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتی ہیں- گنتی کی ان چند شاعرات میں زینب نعمانی تسنیم کا نام بھی بنگال کے لئے باعث فخر و ناز ہے کہ وہ نہ صرف نہایت اچھی شاعرہ ہیں بلکہ ایک خوش فکر ادیبہ بھی- شاعری رنگ جدید میں حیات آمیز رجحانات کی آئینہ دار اور نثر اسلوب خاص کی حامل ہے- انداز بیان جداگانہ زبان صاف و شگفتہ اور طرز تحریر دلچسپ و دلکش ہے-

تسنیم ماہنامہ نگار لکھنؤ کے مشہور مقالہ نگار پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی ایم-اے مرحوم کی بیوہ ہیں- انگریزی اور اردو میں بی-اے (آنرز) ہیں- قیام پاکستان کے قبل کلکتہ میں رہتی تھیں اور اب گذشتہ چار پانچ سال سے ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں-

مضامین نظم و نثر ہند و پاک کے معیاری جریدے مثلاً عصر جدید اردو کلکتہ، ماہ نو کراچی، خاور ڈھاکہ، وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں- نمونہ نثر کے سلسلہ میں تسنیم کے چند خطوط جو ماہنامہ خاور ڈھاکہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکے ہیں- ان میں سے ایک خط کا اقتباس ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے جس سے ان کے ذوقِ ادب، مخصوص طرزِ تحریر اور شاعرانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے- اور بقول عندلیب شادانی .... "یہ خطوط حکایت، لذّانہ

نہیں ایک سوگوار زندگی کی حقیقی روداد ہیں اس لئے ان کا حرف حرف درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے یہ خطوط انھوں نے اپنے عزیز کو لکھے تھے۔ ان کی اہمیت صرف پاکیزہ زبان اور دلنواز پیرایہ بیان ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے اندر اور بھی بہت کچھ ہے جو بقدر ذوق ان کا مطالعہ کرنے والوں کو مل سکتا ہے:۔"

"ارے میرے بھائی! تم نے تو بس حد کر دی۔ تمھارے خطوط پڑھ کر غور کرنا پڑتا ہے کہ غالب اور اقبال کے کلام میں زیادہ معنی آفرینی ہے یا تمھاری گفتاریں۔ کبھی تو سیدھے سادھے خط لکھا کرو۔

سوچتی ہوں کیا روح کے پرواز کر جانیکا نام موت ہے؟ نہیں موت آسمان کی رفعتوں پر منڈلایا نہیں کرتی اور نہ ثریا و پروین کے نغماتی رقص میں شریک ہو سکتی ہے اس کا رفعت و بلندی سے کیا تعلق؟ موت کو دیکھنا ہو تو آؤ بنگال کے سسکتے رینگتے ہوئے افلاس زدہ انسانوں کو دیکھ کر ان غریبوں کی خمیدہ کمر پر تم کو موت کوڑے برساتی ہوئی نظر آئیگی بھائی! تم دیکھ سکو گے کس طرح موت کے بے رحم جنبڑے نے مفلس کی بوسیدہ اور شکستہ ہڈیوں کو پیس کر سرمہ کر دیتے ہیں وطن کی حالت پر غور کرتی ہوں تو خود کو انسان کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

خمار

نام مہ جبین۔ تخلص خمار۔ الہلال کلکتہ کے نائب مدیر مولانا قطب الدین کی اہلیہ شاعر بھی تھیں اور مضمون نگار بھی۔ غزلوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ وحشت، جگر، جوش، سیماب، احسان دانش، ساغر وغیرہ جیسے ماہران فن سخن داں نے ان کے کلام کی داد دی۔ صحیفۂ فطرت کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔

جمیلہ بیگم

کا ناول "فیروزہ" خواتین کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

محمودہ بیگم مدنا پور (مغربی بنگال) کی رہنے والی ہیں۔ خواتین ناول نگاروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا ناول "روشنک بیگم" معرکہ آرا تصنیف ہے۔ اس میں لکھنؤ اور دہلی کی خانگی زندگی کا خاکہ نہایت مؤثر دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے۔ وہاں کی روزمرہ کی زبانیں اور محاورے بڑی بے ساختگی و برجستگی کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنؤ یا دہلی کے کسی گھر میں بیٹھے وہاں کے ماحول سے بہت قریب ہیں اور شک تو کیا یقین ہونے لگتا ہے کہ کتاب ایسی خاتون نے سپرد قلم کی ہے جس کی ساری زندگی خود اس ماحول کی عطیہ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمودہ بیگم ایک پردہ نشین خاتون ہیں اور انھوں نے لکھنؤ یا دہلی تو کیا آج تک مدنا پور کے احاطہ سے کبھی قدم باہر نہیں نکالا۔

انجم نام عائشہ خاتون تخلص انجم۔ صوبہ بہار میں پیدا ہوئیں۔ عرصہ سے بنگال میں قیام ہے۔ تقسیم بنگال کے بعد سے اب تک ستاہار (مشرقی بنگال) میں اقامت پذیر ہیں۔ کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ کلام صاف اور روانی و برجستگی سے مملو ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

عشقِ آزارِ جاں نہ ہو جائے | زندگی امتحاں نہ ہو جائے
رہنما ہے جنونِ شوق اپنا | گم کہیں کارواں نہ ہو جائے
حاصلِ دردِ دل ہے رشکِ انجم | مفت میں رائیگاں نہ ہو جائے

تقسیم ملک کے بعد کلکتہ میں آج بھی ایسی اہلِ ذوق خواتین موجود ہیں جن کی شاعری کا بنگال کے ہر چہار طرف چرچا ہے خصوصاً کلکتہ کے رسائل و اخبارات اور ادبی حلقوں میں ان کا کلام بڑی دلچسپی سے پڑھا اور سنا جاتا ہے ان میں سے بعض کا تعارف حسبِ ذیل ہے۔

صغریٰ بیگم صغریٰ بیگم سبزداری پروفیسر طاہر رضوی ایم۔اے مرحوم کی بیوہ ہیں کلکتہ میں پیدا ہوئی۔ اور یہیں زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ ان کی ساری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزری ہے۔ تعلیم بی۔اے تک حاصل کی ہے۔ تقسیم کے پہلے تک سخاوت میموریل گرلس اسکول میں بحیثیت معلمہ اردو اور فارسی کی تعلیم دیتی تھیں۔ اصلاحی و تعمیری مضامین لکھنے کی شائق و دلدادہ ہیں۔ ماہنامہ تجلی کلکتہ جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء جاری رہا، کی مدیرہ رہ چکی ہیں کئی درسی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں جو کلکتہ یونیورسٹی کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں

مخفی نام صالحہ بیگم۔ تخلص مخفی۔ کلکتہ کی مشہور شاعرہ ہیں۔ عرصہ سے شعر کہتی ہیں۔ ادبی مذاق فطرت سے ودیعت ہے۔ کلام صاف اور پختہ۔ خیالات کم اور جذبات زیادہ ہیں۔ اکثر اشعار زندگی کی تلخیوں کا آئینہ دار ہیں۔ ایک غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پیروں میں آبلے ہیں آنکھوں سے خوں رواں ہے
کوئی نہیں بتاتا منزل مری کہاں ہے؟

حاصل ہے دل کو لذت اندوہ رودادِ غم سے
دلچسپ زندگی ہے رنگین داستاں ہے

انجام زندگی کا اک مشتِ خاک مخفی
گر پاک رہ سکے وہ اکسیر بے گماں ہے

اختر نام سعیدہ خاتون۔ تخلص اختر۔ کہنہ مشق شاعرہ اور ادیبہ ہیں اردو زبان پر اہل زبان جیسی قدرت رکھتی ہیں۔ پروفیسر عبدالرحیم ایم۔اے (علیگ وڈھاکہ) کی شریکِ حیات ہیں۔ پیدائش ۹ دسمبر ۱۸۹۹ء بمقام کلکتہ ہے۔ ان کی طبیعت ہمیشہ سے ادیبانہ اور شاعرانہ ہے افسوس

کہ زمانے کی بے قدری یا ان کی اپنی بے نیازی کی وجہ سے انھیں وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جس کی متقاضی ان کی طبعی صلاحیت ہے۔

سعیدہ اختر کا ایک قومی و اخلاقی ناول قیام پاکستان سے چند سال پیشتر کئی حصوں میں زیر طبع تھا اس ناول کا طرز بیان کچھ ایسا مؤثر ہے کہ اہل ہند کا ہر پڑھنے والا اپنی پستی کا فوری احساس کرنے لگتا ہے اور انگریزوں کی بداخلاقی و ستمگری سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ افادی پہلو جس کی بنا پر انگریزوں کو خطرہ محسوس ہوا چنانچہ اس ناول کا پہلا حصہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپا ہی تھا کہ انگریزوں نے نہ صرف کتاب بلکہ پریس بھی ضبط کر لیا۔

سعیدہ اختر ۱۹۴۴ء یعنی عالمگیر جنگ کے آخری ایام میں یونیورسٹی پوسٹ گریجویٹ کے ممنوعہ اجلاس میں اردو میں تقریر کرنے کے جرم میں چار ماہ قید با مشقت کی سزا بھی بھگت چکی ہیں جیل سے رہا ہونے کے بعد "قید فرنگ" کے عنوان سے مضامین کا دلچسپ سلسلہ روزنامہ "ہند" کلکتہ میں شروع کیا اور یہ تمام مضامین بعد میں کتابی شکل میں چھپے۔ نواب نصیر حسین خیالؔ مرحوم نے اس کتاب پر سیر حاصل تبصرہ تحریر کیا تھا۔

غزل، قطعات، رباعیات، ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز مترشح ہے بطور نمونہ ایک المیہ غزل کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

میری خاموش راتوں میں سکونِ قلبِ مضطر ہے
مرے پُر شور نالوں میں مسرت آج رقصاں ہے

مری تاریک دنیا میں ضیا باری ہے رحمت کی
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں وفورِ شوق مہماں ہے

نرالی شان میں اختر ہے شکووں کی فراوانی
یوں رودادِ ستم کہہ کر تخیل خود پشیماں ہے

سعیدہ اختر کو مولانا راشد الخیری کا رنگ بہت مرغوب ہے اس لئے ان کا کلام غم و الم میں ڈوبا ہوتا ہے ایک شعر ملاحظہ ہو۔ کتنا گہرا احساس ہے ؎

مرے معبود کیوں تخلیق کی زحمت گوارا کی | نہ میں دنیا کے قابل ہوں نہ دنیا میرے قابل ہے

اختر کے حالاتِ زندگی انگریزی میں بھی چھپ چکے ہیں۔

راحت رضیہ بیگم المتخلص بہ راحت ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کلکتہ میں پیدا ہوئیں سعیدہ اختر کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ شاعری کا ذوق آغوشِ مادر کا عطیہ ہے۔ کلام کا رنگ اہلِ لکھنؤ جیسا ہے۔ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

جو ان کی جبیں سے روشن تھی جس میں تھا اندھیرا زلفوں کا
وہ صبح تمنا دیکھی ہے نہ شام مسرت دیکھی ہے
راحت اپنی نشیلی آنکھوں سے تو نے تو بہت کچھ دیکھا ہے
دل روئے نگاہیں ہنستی ہوں ایسی بھی صورت دیکھی ہے
مانا کہ بے ثمر ہے مگر کیوں نہ تسلم کریں | شاید کبھی پھلے شجر آرزو تو ہے

مراد نجمہ بیگم مراد کی ولادت ۲۹ نومبر ۱۹۱۷ء بمقام کلکتہ ہوئی افسوس عین شباب میں دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ مختصر سی عمر میں جو کچھ کہا بہت خوب کہا۔ لفظی رعایت، زبان کی صفائی، اندازِ بیان کی برجستگی کلام کی خصوصیات ہیں ؎

تاثیر نہ آہوں میں نہ فریاد و فغاں میں | اور میں ہوں کہ نالوں میں اثر ڈھونڈ رہی ہوں
دریائے تخیل کی ابھی تہہ کو نہ پہونچی | میں قطرے کے سینے میں گہر ڈھونڈ رہی ہوں
کیا خوب ہے میری بھی ناکام تمنا | شام غم ہجراں کی سحر ڈھونڈ رہی ہوں
جس در کی تمنا میں ہوں ناکام تمنا | اک سجدے کی خاطر وہی در ڈھونڈ رہی ہوں

آغوشِ محبت میں مچلتی ہیں مرادیں — اے دل ذرا تھم جا انھیں پھر ڈھونڈ رہی ہو

سوزاں

سوزاں بیگم سوزاں - جواں سال شاعرہ - باپ پروفیسر، ماں سخن سنج شعر و ادب کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے بچپن سے ذوقِ شعری نے انگڑائی لی - غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہتی ہیں - شاعری کا بیشتر حصہ اخلاقیات قومیت، اسلامیات کے موضوعات پر مشتمل ہے -

ایک نظم "پردیں" کے چند اشعار رہ یہ قارئین ہیں جو شوخیٔ بیان شگفتگیٔ زبان اور روانیٔ کلام کے اعتبار سے خوب ہیں ؎

کس قدر پاکیزہ کتنی دلنشیں و سادہ کار — میری ہمدم میری پردیں میرے خوابوں کی بہار
تیری فطرت کی بلندی رفعتِ پرویز ہے — تیری نظروں میں عیاں اوجِ ثریا کا وقار
گفتگو تیری ہے گویا آسمانی زمزمہ — جس کی شوخی پر فرشتوں کا تبسم بھی نثار
یہ مذاقِ شاعری یہ تیرا ذوقِ ادب — کچھ فزوں تر ہو گیا ہے ان سے بھی تیرا وقار
جیسے کلیوں کی لطافت جیسے پھولوں کی شمیم — یوں حریمِ خواب میں ہوتی ہے آ کر جلوہ بار
بے ارادہ خواب کی وادی میں آ جاتی ہے تو — بے سبب تیرا خیال آتا ہے دل میں بار بار

سوزاں کے کلام میں نازک بیانی کے ساتھ ساتھ مزاح و ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے -

کلکتہ کی طوائفوں میں بھی کئی شاعرہ گذری ہیں - کلکتہ کا قدیم ماہنامہ "نتیجۂ سخن" میں غیر طرحی شاعرہ کا سلسلہ جاری تھا جس میں شاعرات بھی حصہ لیا کرتی تھیں متذکرہ بالا شاعرات کے علاوہ سرو ناز شیریں، سیدہ بیگم محجوب - مہر تسکین، بیگم صوفیہ کمال، شہناز عذرا، بیگم نہاں، قمر النساء بیگم حجاب زہرہ بیگم حیا - شمس النساء مخمور - جمیلہ خاتون قمر - فصیح النساء فصیح اور امیر مشرقی ایم - اے کی دو صاحبزادیاں جو اردو میں ایم - اے ہیں - وغیرہ

بھی شعر و ادب سے کافی ذوق رکھتی ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں لکھتی رہتی ہیں۔ بعض کا مجموعۂ کلام بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔

قطعاتِ تاریخ

وفاؔ یہ آپ کی برسوں کی کاوش کا نتیجہ ہے
کہ ہے بے لوث خدمت کا صلہ "بنگال میں اردو"
طلب ہے عیسوی تاریخ کی شرقیؔ، تو یہ کہہ دے
شگفتہ ہے یہ تحقیقِ وفاؔ "بنگال میں اُردو"

۱۹۵۴ء

امیر الاسلام شرقی ایم اے

خوب تفصیل سے ہے ذکر سخندانوں کا
واقعی داد کے قابل ہے وفاؔ کی محنت
لکھئے یہ مصرعۂ تاریخ جنابِ کاملؔ
آج "بنگال میں اردو" کی بجا ہے شہرت

۱۳۷۴ھ

کامل صدیقی بریلوی

بنگال میں اُردو صحافت

کسی ملک کے ادب، سیاست اور زبان کی ترقی و توسیع کے اہم ذرائع وہاں کے پریس اخبارات اور رسائل وجرائد ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں مثلاً روس، امریکہ، یورپ، جاپان اور چین میں کثرت سے رسائل و اخبار شائع ہوتے اور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں عوام تک پہنچائے جاتے ہیں۔

مقام افسوس ہے کہ غیر ممالک کے مقابلہ میں برصغیر ہند و پاک کے اخبارات و رسائل اول تو قلیل الاشاعت ہوتے دوسرے تھوڑے ہی مدت میں جاری رہ کر روپوش ہوجاتے ہیں۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ جن میں سب سے اہم وجہ حکومت

کی ان اخبارات و رسائل کی طرف سے بے توجہی اور اکثر اوقات جائز و ناجائز دباؤ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ان چیزوں کے باوجود موجودہ بحرانی و انقلابی دور کی تعمیر و اصلاح میں ہمارے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا جو نمایاں حصہ رہا ہے وہ دنیائے صحافت میں ہمیشہ درخشندہ و تابندہ رہیگا۔ ذیل میں ان اخبارات و رسائل کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا اردو ادب و صحافت کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے۔

ایک مورخ کا بیان ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلا پریس ۱۷۷۸ء میں قائم ہوا لیکن مزید تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے پریس وجود میں آچکا تھا اور انگریزی کا پہلا اخبار ۱۷۷۴ء میں "انڈیا گزٹ" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔

مدراس میں سب سے پہلا اردو اخبار بنام "عمدۃ الاخبار" (غالباً سنہ ۱۸۶۶ء) میں شائع ہوا۔[۱]

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ایک مضمون مطبوعہ سہ ماہی "اردو" اپریل سنہ ۱۹۳۵ء حیدرآباد دکن میں درج ہے کہ اردو میں سب سے پہلا اخبار "اردو اخبار" کے نام سے شائع کرنے کا سہرا صاحب آب حیات مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے والد مولانا محمد باقر حسن کے سر ہے اور اس کا مقام اشاعت دہلی تھا۔ لیکن اس سے قبل اپریل سنہ ۱۸۲۳ء میں کلکتہ میں "جام جہاں نما"[۲] کے نام سے ایک ہفت روزے کا اجرا ہوا جو فارسی اور ہندوستانی زبان میں اردو ٹائپ میں اشاعت پذیر ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر لال شود اسوک منشی تھے۔

۱؎ "مدراس میں اردو" صفحہ ۱۴۳۔ از نصیر الدین ہاشمی

۲؎ خطبات گارسن دی تاسی صفحہ ۳۲۱

" اردو گائیڈ" کلکتہ جو ہندوستان کے اولیں اخبارات میں تھا ۱۸۶۸ء تک جاری رہا۔ مولوی کبیرالدین بنگالی اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے سب سے پہلے اخبار کی اشاعت کا فخر بنگال کو حاصل ہے۔

گو بنگال اردو مرکز سے دور رہا مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہاں کی محفلیں ہمیشہ سے اربابِ علم و ادب اور اکابرِ سخن کی تجلیاتِ شعر و ادب سے جگمگاتی رہیں اور سرمایۂ زبان ادب میں گرانمایہ اضافہ ہوتا رہا۔ کلکتہ، ڈھاکہ وغیرہ میں حیدرآباد دکن، لاہور اور دہلی کی طرح پریس و کتابت کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث نشر و اشاعت کے ذرائع ہمیشہ مسدود رہے اور معدودے چند مشہور ہستیوں کے علمی و ادبی کارنامے کتابی شکل میں یا اخبارات و رسائل کے ذریعہ منظرِ عام پر نہ آسکے جس سے اہلِ مشرق کی اردو نوازی، ذوقِ ادب، علمی کاوشوں، مجلسی سرگرمیوں اور بے پناہ خدمات کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود بنگال جیسی بنجر و سنگلاخ سرزمین سے اردو کے بے شمار روزنامے، ہفت روزے، ماہنامے اور قلمی پرچے نکلتے اور زمانے کی بے قدری کی نذر ہوتے رہے۔ ان کے ذریعہ بنگال میں اردو کی جو بے لوث و ناقابلِ قدر خدمات انجام دی گئیں اور اردو زبان و ادب کا جو رجحان پیدا کیا گیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۸۵۹ء میں بنگال کے صرف شہر کلکتہ میں بیس پریس[1] تھے۔

۱۸۲۲ء سے بیسویں کی ربع صدی تک بنگال میں جتنے رسائل و اخبارات جاری ہوئے سب کی مکمل فائلیں "امپریل ریکارڈس" "بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

---

[1] دیکھئے۔ (SELECTION FROM THE RECORDS OF THE BENGAL GOVERNMENT)

مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ اور قبلہ محترم حضرت محمود طرزی کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں
ذیل میں انیسویں صدی میں صرف کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبارات کی مختصر سی فہرست[۵۱] پیش کی جاتی ہے۔

نام اخبار	ایڈیٹر	تاریخ اجرا	نام اخبار	ایڈیٹر	تاریخ اجرا
ہفت روزہ مرات الاکبر	رام موہن رائے	۱۸۲۲ء	روزنامہ ماہ عالم افروز (بزبان فارسی)	دہاج الدین	۱۸۳۳ء
" شمس الاکبر	من رام ٹھاکر	۱۸۲۳ء	ہفتہ وار آئینۂ سکندر (بزبان فارسی)	؟	۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء
ماہنامہ دی بنگال ہیرلڈ	رابرٹ منٹگمری مارٹن	۱۸۲۹ء	روزنامہ سلطان الاخبار (بزبان فارسی)	؟	۲ اگست ۱۸۳۵ء
(یہ رسالہ انگریزی، بنگلہ، فارسی، ہندوستانی، ناگری پانچ زبانوں میں شائع ہوتا تھا)			" دار السلطنت	مولوی عبدالکریم سلہٹی	۱۸۸۶ء
روزانہ سماچار سبھا راجندر (فارسی و بنگالی زبان میں)	شیخ علیم اللہ	۱۸۳۰ء			
ہفت روزہ نظام شمسی	کالی کرشنا	۱۸۳۰ء			

اب بیسویں صدی کے اخبارات و جرائد کی فہرست ملاحظہ فرمایئے جس سے اندازہ ہو جائیگا کہ بنگال میں اردو زبان کی بقاء و ارتقاء کیلئے طرح گلشن صحافت میں کیا کیا گلہائے رنگا رنگ کھلائے گئے اور حامیانِ اردو نے اپنے خون، ایثار و محبت سے اس باغ کو کس طرح سینچا۔

روزنامہ الہلال ــــــــ مولانا ابوالکلام آزاد کی بے پناہ علمی قابلیت

---

۵۱ مسلم ریویو، اپریل، جون ۱۹۲۹ء

اور عدیم المثال ادبی صلاحیت کو زندہ رکھنے کے لئے الہلال کی فائلیں کافی ہیں۔ یہ وہ پہلا اخبار ہے جس نے نہایت ہی قلیل مدت میں سارے ہندوستان میں ادب وصحافت کا سکہ جما دیا تھا۔ اس نے نہ صرف دوست و دشمن سے آزاد کی قابلیت وشخصیت کا لوہا منوایا بلکہ بڑے بڑے شہسواران صحافت کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ الہلال کے عنوانات کو فخر و مباہات کے ساتھ دیگر مدیران اپنے اخبار و رسائل میں اپنا لیتے تھے۔ الہلال کا غیر فانی کارنامہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کو کچھ اس طریقے سے پیش کیا کہ مسلمان سیاست، معاشرت، تعلیم، ساری باتوں کی اصلی بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم بتائی۔ الہلال کے علمی ادبی، سیاسی مضامین نے نہ صرف مذہبی پیشواؤں، علماء و مشائخ کو متاثر کیا بلکہ نئی روشنی کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بھی نشانِ راہ کا کام کیا۔ مختصر یہ کہ تاریخ ادبیات ہند میں الہلال کا نام زریں حرفوں میں لکھا جائیگا۔ حامیان ادب ڈھائی سو سال میں جو کام نہ کر سکے ادب اردو کے اس امام اعظم نے اپنے مختصر سے لمحاتِ حیات میں کر دکھایا الہلال سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک یعنی صرف ۶-۷ سال جاری رہا۔ اس عرصہ میں مولانا کو کئی بار جیل بھی جانا پڑا جس کی وجہ سے معرضِ التوا میں بھی پڑا رہتا۔

۲-۳ ہند و آزاد ہند ـــــ ہندوستان کے چوٹی کے ادیب، سیاست داں، صحافی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے زیرِ ادارت فروری سنہ ۱۹۳۱ء میں بمقام کلکتہ جاری ہوا۔ شروع میں کچھ دنوں تک "الھند" کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ خلافت اور کانگریس تحریکات کے زمانے میں اس اخبار نے بڑا کام کیا۔ آج بھی کانگریسی تحریکوں کی حمایت اس کی پالیسی ہے۔ ہند کے ہفتہ روزہ کے علاوہ سال میں تین چار خاص نمبر اور عید نمبر شائع ہوا کرتے

تھے اور ہر نمبر سیاستِ حاضرہ پر ٹھوس بحث کے علاوہ بلند پایہ مقالات، نظموں اور افسانوں کے اعتبار سے ایک شاہکار ہوتا۔ ھند آج بھی کلکتہ کا کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ موجودہ ایڈیٹر غلام سرور فگار۔ بی اے علیگ ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ملیح آبادی روزآنہ ہند سے علیحدہ ہو گئے اور "آزاد ہند" نکالا ذاتی پریس بھی خرید لیا تھا۔ آزاد ہند کا دیگلی ایڈیشن "اجالا" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

ملیح آبادی آجکل دہلی میں مقیم ہیں۔ آزاد ہند کے موجودہ ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی (موصوف کے صاحبزادے) اور ابراہیم ہوش (کلکتہ کے مشہور ادیب و اخبار نویس) ہیں۔

عصرِ جدید کلکتہ —— اس کا پہلا نام دورِ جدید ہے ۳۰-۳۵ سال جاری ہے۔ پہلے ہفت روزہ کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ شائق احمد عثمانی اس کے ایڈیٹر و پبلشر ہیں۔ ملک کے مشہور فنکار وصحافی بھی اس کے دامنِ ادارہ سے وابستہ رہے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اختر حسین عشردی۔ ڈاکٹر ارشد عظیم آبادی۔ چراغ حسن حسرت کاشمیری۔ سلیم اللہ فہمی۔ عبدالجبار وحیدی۔ محمد سلیمان واصف۔ جمیل مظہری۔ ابراہیم ہوش عبدالکریم صدیقی۔ تقسیم ملک سے قبل عصرِ جدید کی پالیسی مسلم لیگ تحریکات کی حمایت تھی۔ اب یہ کراچی سے قیصر عثمانی کے زیرِ ادارت اور کلکتہ سے جان محمد کی زیرِ نگرانی شائع ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بعض روزناموں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نام	مقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجرار
الہلال	کلکتہ	وحیدالدین نور۔ اقبال اکرامی	۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۲ء

نام بمقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجراء	نام بمقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
رسالت کلکتہ	مولانا ابو القاسم اور رفیق ڈولاری	۳۰ سال قبل شائع ہوتا تھا	طوفان کلکتہ	مولانا کامل	۵۱ تا ۱۹۵۲ء
انوالخیا "	حکیم رکن الدین	۱۹۱۲ء	بنگال پنچ "	سوالی	؟
الحق "	ادریس الحق، فاطمی بی اے (آنرز)	۱۵ر جنوری ۱۹۵۳ء	ہمدرد "	خان شفاعت اللہ خاں،	؟
	حال ولی اللہ بی اے بمعز الدین	دس سال سے جاری ہے		عبدالجبار وحیدی	
	اسرائیل احمد۔		مزدور گزٹ	مولانا عبدالجبار، دانی کے، طارق	۳۳ یا ۱۹۳۴ء
کارواں "	ش مظفرپوری۔ یونس نظری	بارہ سال سے جاری ہے	جہاد "	دانی کے، طارق	؟
جمہور "	پبلشر قاضی عبدالغفار خاں	سنہ ۱۹۱۸ء	راعین گزٹ	"	؟
	ایڈیٹر کیفی چریاکوٹی		اکھاڑا "	"	؟
نئی دنیا "	سید صدیق حسین قتیل انصاری	؟	المشرق ڈھاکہ	شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن احسن	۱۹۰۶ء
نیا زمانہ "	جمیل مظہری۔ ایم۔ اے	؟	پاسبان "	رفیع احمد قدوائی	۶ر جون ۱۹۴۹ء
	عبدالجبار وحیدی مرحوم		انقلاب "	غلام احمد	۱۹۵۳ء
زمانہ "	کیفی چریاکوٹی	؟	انگارہ "	یوسف رضوی	۱۹۵۲ء
مدبر "	سید مسعود محسن زبیری	؟	مشرقی پاکستان "	ڈاکٹر عندلیب شادانی	۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء
اقبال "	سید شبیر حسین	؟	امروز کلکتہ	اقبال اکرامی	۱۵ر مارچ
نیو مجاہد "	عابدی فیض آبادی	۱۹۵۱ء			۵۳ء سے
خادم کعبہ ہوم "	دور خلافت میں شائع ہوتا تھا	۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء	روزنامہ ستارہ کلکتہ		جاری ہے۔
انگارہ کلکتہ	غازی اسلامی، ادریس الحق	۵۱ تا ۱۹۵۲ء		رفیع احمد قدوائی	۱۹۵۲ء
ہمدرد "	مولانا محمد علی جوہر	؟			۱۹۵۳ء

ہفت روزے (ان میں سیاسی، ادبی، نیم فلمی بھی شامل ہیں)

نقاش :- کلکتہ کے ہفتہ وار رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور پابندئ وقت

ساتھ چھپتا ہے اس کے خاص نمبر شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نقاش کا عید نمبر ۱۹۴۶ء میرے زیر نظر ہے۔ اس کے معیار کا اندازہ اس کے لکھنے والوں کے چند ناموں سے کر لیجئے مولانا ابوالکلام آزاد، رضا علی وحشت کلکتوی، ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی، آغا حشر کاشمیری مرحوم علامہ جمیل مظہری ایم اے۔ عبدالقیوم حسرت نعمانی مرحوم، فدا علی خنجر لکھنوی مولانا تمنا عمادی پھلواروی وغیرہ۔

رسالہ	مدیر	سنہ	رسالہ	مدیر	سنہ
کلکتہ گزٹ کلکتہ	.	.	نورتن کلکتہ	محمد رفیع	۴۱ تا ۴۳ء
چٹپٹ "	اقبال اکرامی، فہیم الدین احمد، حسین شیخ پوری	دسمبر ۱۹۵۰ء تا اپریل ۱۹۵۱ء	عبرت ہوڑہ	جوہر غازیپوری	۱۹۴۱ء
نیا سنسار "	جہاں بی۔اے	۱۹۴۵-۴۴ء	شعلہ کلکتہ	سرپرست جرم محمد آبادی، نگراں رضا مظہری ایم اے بی ٹی	۱۹۴۹ء
کلکتہ ویکلی "	عابد داناپوری	۱۹۳۵ء			
ہنگامہ "	دائی کے طارق	۳۰ تا ۱۹۳۲ء	حور "	بیگم قتیل انصاری، نورالہدا	۳۲ تا ۳۳ء
نئی منزل "	ناظر الحسینی، بخشی لاہوری	۱۹۴۵-۴۶ء	ایثار "	عبدالوصیع، جمیل مظہری	۳۵ تا ۳۶ء
منزل "	ناظر الحسینی	۱۹۴۶ء	کلیم "	مولانا قطب الدین احمد	؟
ضرب کلیم "	ابراہیم ہوش، شمیم پھلواروی	۱۹۴۶-۴۵ء	شفا "	حکیم محمد یوسف خضر پوری	؟
مخدوم "	حامد مقصود صابری	۳۳ تا ۱۹۳۶ء	پیغام مٹیابرج		؟
خادم "	ایس، ایم جعفری۔ ابراہیم ہوش	۳۲ تا ۱۹۳۶ء	المومن کلکتہ	مولانا عبدالحئی	؟
البیان "	کامل	؟	الست "	عبدالحق	؟
ماہ تمام "	محمد اسحق امرتسری	؟	صداقت "	فیض قادری	۳۰ سال سے شائع ہوتا ہے
پیارہ "	قاری رحمت اللہ	؟	ہنٹر "	وحیدالدین نور	۳۸-۱۹۴۵ء
ستارہ "	افضلی	؟	تازیانہ "	فہیم الدین	؟
نظام "	سرپرست آرزو لکھنوی مرحوم۔ پرتو لکھنوی، ابراہیم ہوش۔ جرم محمد آبادی۔		اردو "	پرویز شاہدی ایم اے	۲۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء، ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء
	تندرس صہبائی تین سال تک کلکتہ میں جاری رہا	۱۹۴۲ء	بیداری "	شاہ محمد میاں صابری	یکم مئی ۱۹۴۸ء
	پھر بمبئی منتقل ہوگیا آجکل لاہور سے شائع ہوتا ہے۔		ہرمینر " بزبان فارسی	عابدی فیض آبادی۔ شمیم پھلواروی۔ یوسف نقوی	۱۹۵۲ء

نیزان ۔ سید پور		۱۹۵۷ء	المہاجر ۔ چاٹگام	ظفر تبریزی ۔ رازی
مرزوان ڈھاکہ			حروف القرآن	مولانا ذوالفقار
امین ۔ ،،	شمیم پھلواری ۔ خالد عرفانی رامپوری	مئی ۹۴۶ء تا اکتوبر ۹۴۶ء	(یہ بنگلہ زبان کا وہ واحد اخبار ہے جو عربی رسم الخط میں چھپتا ہے)	

پندرہ روزہ

ماہنامے

چندن کلکتہ	ابراہیم شاہ	مئی ۴۴ء	ماہ تمام کلکتہ	محمد اسحٰق امرتسری جمیل مظہری	۱۹۳۵ء
کسوٹی ،،	کاوش ورنگیں	۴۸-۵۰ء	آئینہ	سہیل عظیم آبادی	
مشرق ،،	شمس شیدائی ایم اے	۳۵ء	رباب سید پور	احمد سعدی	۱۹۵۴ء
ارمغاں ،،	قدوس صدیقی	۴۹ء	آفتاب کلکتہ	چراغ حسن حسرت	۱۹۲۹ء
سیلاب ،،	لطیف الرحمن ۔ ادریس الحق	۴۷ء	باغباں ،،	لیئق لکھنوی	؟

نتیجۂ سخن :۔ بنگال کا سب سے پہلا ماہنامہ ۔ بقول حسرت موہانی مرحوم فروری ۱۸۸۱ء کو جاری ہوا ۔ اور جنوری ۱۸۸۶ء کے بعد تک نکلتا رہا ۔ مرتب منشی محمد وزیر عظیم آبادی ۔ غزلیں نظمیں مضامین رنگارنگ سے مزین ہوتا تھا ۔ ہند کے نامور اور بنگال کے گمنام اہل قلم کے رشحات شائع ہوتے تھے ۔ لکھنے والوں میں داغ ، خواجہ قمر الدین ۔ نادر شاہ شوخ رامپوری ، شاغل دہلوی ، شاد عظیم آبادی ، وحید العصر مولوی عبد الرؤف وحید بہادر شاہ اختر ، سید علیخاں بدخشاں ، مرزا سعید الدین احمد شاگرد غالب ، قاضی محمد اختر ، عبد الغفور نساخ جیسے نامور اہل قلم و شہرۂ آفاق فن کاروں کے اسمائے گرامی اس کے معیار کی بلندی اور ہمسروں کی کامیابی کے ضامن ہیں اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت رسالہ تھا ۔

جادو ڈھاکہ	خالد بنگالی ، حکیم حبیب الرحمن	۱۹۲۳ء	اختر بولانی (ضلع میمن سنگھ)	خالد بنگالی	۱۹۳۴ء

مفکر ڈھاکہ	نگراں ڈاکٹر عندلیب شادانی	۱۹۴۸ء	خاور ڈھاکہ	ڈاکٹر عندلیب شادانی	اپریل ۱۹۵۲ء
شاہین "	ایڈیٹر قمر عثمانی	؟			تا ۱۹۵۳ء

جدید اردو ـــــــ سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ اداریہ تحریر میں پروفیسر پروینہ شاہدہ ایم۔ اے، پروفیسر احسن احمد اشک ایم۔ اے، یونس احمر ایم۔ اے اختر ماہ پوری، عبدالجلیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جدید اردو ملک کے اولین درجہ کے رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ کلکتہ کا مقبول ترین علمی و ادبی رسالہ تھا۔ سالنامہ سنہ ۱۹۴۱ء بنگال نمبر سنہ ۱۹۴۵ء، ٹیگور نمبر سنہ ۱۹۴۱ء وغیرہ نہایت شاندار اور عدیم المثال نمبر ہیں۔ اس رسالہ کو بنگال کے چوٹی کے شعراء ادبا کے علاوہ ہندوستان کے مشہور و ممتاز فنکاروں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اس کے تمام نمبروں کا ایک، ایک نسخہ راقم الحروف کے ذاتی کتب خانوں میں موجود ہے۔

شمس ـــــــ علامہ وحشت کلکتوی کے استاذی مرحوم ابوالقاسم شمس فریدپوری کی یادگار ہے آج سے تقریباً ۳۰۔۳۵ سال قبل منشئہ شہود پر آیا حبیب النبی خاں صولت مرحوم جیسے جلیل القدر ادیب با کمال شاعر اس کے فاضل مدیر تھے۔ اقبال، حسرت، اثر، وحشت، ناطق، آرزو، جیسے علمبردارانِ ادب اس کے مستقل معاونین تھے۔ صولت کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ بند رہا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں دوبارہ طاہر علی شاکر کلکتوی تلمیذِ وحشت کے زیرِ ادارت شائع ہونا شروع ہوا اور آج تک شائع ہو رہا ہے۔

صہبا۔ کلکتہ	محمود طرزی، مفتی گوہر شادانی	جون	نئے دھارے کلکتہ	یونس احمر ایم اے	اکتوبر یا نومبر
	محمد قاسم ادراجی میکش، عزیز	۱۹۳۸ء	دو ماہی	مہدی رضوی ایم اے	۱۹۴۷ء
	زبیری میرٹھی		آوازِ شرق "	تابا القادری	۴۸ء تا ۵۰ء
نئی دنیا "	وفا راشدی	۱۹۴۵ء ۱۹۴۷ء	تجلی "	ضیا عظیم آبادی	جنوری ۴۶ء تا ۱۹۴۷ء
نغمہ نور "	مسرور انور	۱۹۳۴ء	عبرت، ہوڑہ	ڈاکٹر جوہر	۲۰ سال سے جاری ہے

شبستان کلکتہ	ڈاکٹر جوہر	۳۰ سال سے جاری ہے	السست کلکتہ	؟	۱۹۴۸ء
انگڑائی "	عبدالرحمٰن آصف بنارسی ذکاالرحمٰن آصفی رضاالرحمٰن آصفی	۱۹۴۶ء	شباب "	ڈاکٹر ارشد عظیم آبادی	؟
			شہاب چاٹگام	نسیم بہاری	۱۹۵۰ء
شاہین "	؟	۱۹۴۸ء	مشرق "	کاوش بریلوی	۱۹۵۱ء

دلربا —— بیک وقت انگریزی، بنگلہ اور اردو میں شائع ہوتا ہے اردو میں اگست ۱۹۵۲ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ابوالحسنات محمد عبدالقادر ہیں۔ مگر مسٹر سعداللہ ہم فہمی اور پروفیسر احسن احمد اشک کی محنت و کاوش ہی رسالہ کی کامیابی کا سبب ہے۔ اسے اہل علم طبقہ میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔

نشیمن —— مٹیابرج کلکتہ سے نومبر ۱۹۵۲ء سے جاری ہے۔ فہرست ادارہ میں ظہیر ہاشمی، محمد عثمان، محمد مرزا، صابر ندیم کے نام شامل ہیں۔ نہایت سادہ سنجیدہ مگر بلند معیار رسالہ ہے۔ اردو زبان و ادب کی بقا و ارتقا کے لئے ایسے رسالوں کی اشد ضرورت ہے مگر افسوس ایسے رسالے زندہ نہیں رہتے۔ مشرق دو ماہی چاٹگام ریلوے انسٹی ٹیوٹ اخبارات و رسائل کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے میگزین ہر سال انگریزی اور بنگلہ کے علاوہ اردو زبان میں بھی شائع ہوتے ہیں جو اردو ادب کی ارتقا و ترقی کے ضامن ہیں۔

فلمی پرچے

آج سے تقریباً ۲۰-۱۵ سال قبل سب سے پہلی خاموش فلم "جانِ عالم" کلکتہ

ہیں تیار ہوئی اس کے بعد نیو تھیٹرز کمپنی نے دیوداس، دھوپ چھاؤں، دشمن، جواب، جیسی اصلاحی و معیاری فلمیں پیش کرکے دنیائے فلم میں جو انقلاب پیدا کیا اس کی نظیر آجتک نہیں ملتی۔ ان فلموں کی کہانیاں، مکالمے، گیت، نغمے وغیرہ علامہ آرزو لکھنوی مرحوم جیسے مشہور فنکار کے نتیجہ فکر ہوتے تھے۔ عوام کے مذاق بلند کرنے اور اخلاقی و اصلاحی نقطۂ نظر سے کئی فلمی رسالے بھی منشۂ شہود میں آتے رہے جن میں سب سے پہلا نام "فلم اسٹیج" کا آتا ہے۔ جولائی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ اس کے خریدار چار ہزار سے زائد تھے اور اس کی اشاعت دس ہزار کے قریب تھی۔ اور اس زمانے میں ہندوستان بھر میں کثیر الاشاعت رسالہ تھا اس پرچے کے ادارے میں اختر پشاوری نسیم راشدی، محمود طرزی وغیرہ شامل تھے۔ مگر اس کی کامیابی محض ایک شخص کی جدوجہد، محنت حوصلہ اور جذبۂ خدمت کا نتیجہ تھی اس شخص کا نام شاہ مسعود صابری مرحوم ہے انھوں نے اور کئی فلمی رسالے بھی نکالے جنکی فہرست ذیل میں درج کیجائے گی۔

اگر اردو تاریخ میں فلمی ادب کو کوئی جگہ دی گئی تو سب سے پہلے محمد یعقوب طارق مرحوم (جو فلمی و ادبی دنیا میں وائی کے طارق کے نام سے مشہور تھے) عنایت حسین دہلوی مرحوم مدیر ہفتہ وار چوبیج اور مسعود صابری مرحوم کے نام جلی حرفوں میں قلمبند کئے جائیں گے ان حضرات نے فلمی جریدوں کے ذریعہ بنگال اور بیرون بنگال کے عوام میں اردو زبان کا جو شوق پیدا کیا اور کہانی، ڈرامے اور شاعری کا جو رجحان دلایا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ گو یہ پرچے نام کے فلمی ہوتے تھے مگر فلم اسٹیج پر تنقیدیں، ڈرامے اور کہانیوں پر تبصرے، فلمی صنعت و حرفت سے متعلق مضامین اور فلمی دنیا کے حالات و کوائف جس انداز سے لکھے جاتے تھے وہ نہ صرف دلچسپ اور مؤثر ہوتے بلکہ ادب کا گرانقدر سرمایہ معلوم ہوتے ہیں۔

چند مشہور فلمی رسالوں کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

نام	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
ماہنامہ عکاس	(۱) ایم ایم بیگ (۲) ایس بی صابری	جنوری ۳۶ء تا دسمبر ۱۹۴۱ء

ماہنامہ فلم ریویو	(۱) وائی کے طارق (۲) عبدالرؤف	۱۹۳۰ء
" پردۂ فلم	وائی، کے، طارق	؟
" گرامفون ریویو	یوسف بیگ خادم	اکتوبر ۱۹۳۴ء
" فلم گائیڈ	شاہ مسعود صابری	جنوری ۱۹۳۲ء
" فلمی دنیا	(۱) وائی، کے، طارق (۲) ظفر تبریزی بی اے (۳) شاہ مسعود صابری	۱۹۳۱ء
" شبستان	ایضاً	۱۹۳۴ء
ہفت روزہ چرخ	عنایت حسین دہلوی	۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۱ء

ادبی انجمنیں

تمہید کلکتہ اور ڈھاکہ کی ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام جتنے مشاعرے اور جلسے ہوتے رہے جتنی نظمیں افسانے اور مقالات پڑھے گئے اگر انہیں یکجا جمع کر دیئے جائیں تو سینکڑوں مفید اور معلومات افزا کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور اور دکن کی طرح پریس کی سہولتیں اور نشر و اشاعت کے ذرائع نہ ہونے کے باعث اہل بنگال کے ادبی کارنامے، علمی کاوشیں بنگال کے باہر دور دراز تک نہ پہونچ سکے بنگال میں جن قومی انجمنوں اور ادبی بزموں نے خاموش مگر ٹھوس اور مفید خدمات انجام دی ہیں ان کی صراحت حسب ذیل ہے۔

دہلی انسٹی ٹیوٹ خطبات گارساں دی تاسی صفحہ ۳۲۲ میں درج ہے "۱۲ مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی کالج فنا کر دیا گیا اور اس کا تمام کتب خانہ نذر آتش۔ تو اسکی وقف آمدنی سے چاندنی چوک کلکتہ میں دہلی انسٹی ٹیوٹ نام کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جس میں لارڈ کیننگ کی سفارش سے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی سے جو امداد ملتی تھی اس سے دوگنی کر دی گئی"

مجلسِ مذاکرہ علمیہ اہل اسلام گارساں دی تاسی اپنے خطبات صفحہ ۵۰۰ پر لکھتا ہے۔

"سرسید احمد خاں کی تحریک پر ۱۸۶۳ء میں کلکتہ کے مسلمانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام مجلس مذاکرۂ علمیۂ اہل اسلام، رکھا گیا اسکی صدارت نواب عبدالطیف خان بہادر مرحوم ساکن کلکتہ برادر عزیز عبدالغفور خاں نساخ نے فرمائی۔ سرسید نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح علم وحکومت میں اپنا نام روشن کریں اور یہ تجویز پیش کی کہ ہندو اور مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جسمیں مذہب وملت کی کوئی تفریق نہ ہو اس کمیٹی کے سپرد یہ کام ہو کہ جہاں تک ہوسکے مغربی علوم وفنون کی کار آمد کتابوں یا مذہبی و دینی کتابوں کے ترجمے کئے جائیں جن کے ہندی اور اردو دونوں ایڈیشن ہوں تاکہ ان سے ہندو اور مسلمان دونوں استفادہ کرسکیں۔

اس انجمن نے ۱۰ ہزار روپے کے انعامات ان لوگوں کیلئے مقرر کئے جو اردو میں مندرجہ ذیل موضوعوں پر مضامین لکھیں۔

"حیات اورنگ زیب، ہندی مسلمان، انجمن اور اس کے کل پرزے، مطبع کے تاریخ وتمدن پر اثرات"

اس انجمن کی سرپرستی بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے قبول فرمائی جو اس امر کا ثبوت ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی انجمن کی اہمیت محسوس کی جاتی تھی (خطبات گارسان دی تاسی صفحہ ۵۰۰-۴۳۷)

انجمن اسلامیہ

سنہ ۱۸۶۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی کوشش سے لاہور میں ایک ایسی جامعہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی جس کا ذریعۂ تعلیم اردو زبان قرار پائے پھر ہندوستان کے مختلف صوبجات میں جلسے ہوئے ۱۸۶۷ء میں انجمن اسلامیہ کلکتہ نے دو ہزار لوگوں کے مجمع میں اس تحریک پر زور دیا وغیرہ وغیرہ۔ (گارسان دی تاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہان اردو۔ از محی الدین قادری زور۔ صفحات ۱۲۳-۱۲۰)

سنہ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے مذہب میں جو رسومات قبیحہ داخل ہوگئی ہیں انہیں خارج کردی جائیں۔ راجہ کرشنا بہادر اس انجمن کے صدر تھے اس کی تمام کارروائیاں ہندوستانی زبان میں ہوتی تھیں (رسالنامہ جدید اردو سنہ ۱۹۴۵ء)

مسلم انسٹی ٹیوٹ

سن قیام سنہ ۱۹۰۲ء یہ شہر کلکتہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی، علمی و ادبی ادارہ ہے اس کے بعض شعبے یہ ہیں۔ کتب خانہ کھیل، جمناسٹک، تحریری و تقریری مقابلہ، بزم مذاکرۂ علمیہ اردو، انگریزی، بنگلہ۔ کتب خانے میں ہر زبان و ہر علم و فن کی کتابیں موجود ہیں مشاعرے اور ادبی نشستیں بھی ہوا کرتی ہیں عموماً تمام کارروائیاں اردو ہی میں ہوتی ہیں

ایک انگریزی ماہنامہ (مسلم ریویو) نامی عرصہ تک شائع ہوتا رہا گو یہ رسالہ انگریزی میں چھپتا تھا لیکن اس کے مضامین اکثر اردو، فارسی، عربی علوم و فنون سے متعلق ہوتے اور انہیں زبانوں پر علمی و ادبی بحثیں اور تنقید و تبصرے شائع ہوا کرتے۔ اس کے مستقل قلمی معاونین میں ہندو، مسلم اور ادیبوں کے علاوہ یورپین اور اینگلو انڈین انشا پرداز بھی شامل تھے۔ ہر قسم کی سیاسی، ادبی، مذہبی کارروائیوں کے لئے اس کا ہال مخصوص ہوتا ہے۔ بنگال کی سربرآوردہ ہستیاں اور قومی رہنما اس ادارے کی کمیٹی سے وابستہ رہی۔ اسکے موجودہ صدر سید بدرالدجا سابق ایم۔ ایل۔ اے اور سکریٹری پروفیسر عبدالمجید ایم۔ اے (سنہ ۱۹۵۳ء) محمد کبیر (سنہ ۱۹۵۴ء) ہیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور امپیریل ریکارڈس

کلکتہ کے سب سے بڑے کتب خانے ہیں انگریزوں کے زیر سرپرستی بڑی ترقی کی۔ اردو زبان و ادب کی کتابوں کے علاوہ دیگر ادبیات پر ہر زبان کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں جو دنیا کی لائبریریوں میں نایاب ہیں۔

انجمن ترقی اردو

ڈاکٹر عبدالحق نے جو کوششیں ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اس انجمن کے ذریعہ اردو کی ترقی کے سلسلہ میں کی ہیں اگر تھوڑی سی توجہ بنگال کی طرف بھی مبذول فرماتے تو یہاں بھی اردو کی ترقی کی کافی گنجائش تھی مگر افسوس اس انجمن نے

بنگال میں معمولی سی سرگرمی بھی نہیں دکھلائی۔ لیکن اسکے باوجود کلکتہ کے ارباب ذوق کی کوششوں سے یوم اقبال، یوم حالی وغیرہ کے موقع پر جس طرح علمی و ادبی سرگرمیوں کا ثبوت دیا جاتا رہا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جس دھوم دھام سے یوم حالی منایا گیا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسکی صدارت کیلئے آل احمد سرور لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ علامہ وحشت کلکتوی، سلیم اللہ فہمی، میران الرحمٰن بھی تشریف فرما تھے ان حضرات کے مقالات جو اس جلسے میں پڑھے گئے تھے کتابی شکل میں شائع کر دیئے جائیں تو اردو ادب میں بیش قیمت اضافہ ہو جائے۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں انجمن کی شاخ ڈھاکہ میں بھی قائم ہوئی جس کے افتتاح کے لئے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور جگر مرادآبادی ڈھاکہ تشریف لائے تھے یہ جلسہ دائرہ ادب کے دفتر میں منعقد ہوا تھا۔ راقم الحروف کو بھی اس جلسہ میں شرکت کا فخر حاصل ہے۔ اب تک مختصر سی لائبریری اور چند مشاعروں کے علاوہ اس انجمن کی کوئی ٹھوس کارروائی نظر نہیں آئی لیکن مستقبل قریب میں اس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ اسکی ایک شاخ حال ہی میں چاٹگام میں بھی قائم ہو چکی ہے۔

دلکشا انسٹی ٹیوٹ پہلے اس کا نام دلکشا لائبریری تھا۔ کوئی بیس سال قبل اسکی بنیاد رکھی گئی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے بعد کلکتہ کے مسلمانوں کا یہ دوسرا ادارہ ہے جہاں ہر قسم کی کتابوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کا باقاعدہ انتظام ہے۔ محمد خلیل بی۔اے اور عابد حسین اس کے بانی ہیں۔ آخرالذکر اس کے مستقل سکریٹری بھی ہیں۔ کلکتہ کا یہ واحد عوامی ادارہ ہے جس کی اپنی عمارت ہے۔

بزم احباب ۱۹ جون ۱۹۲۰ء بمقام کلکتہ قائم ہوئی۔ ہر ماہ کلکتہ کے اہل علم اور ارباب ذوق کا خاص اجتماع ہوتا ہے جس میں نہایت ٹھوس، مفید اور دلچسپ تخلیقات پیش کی جاتی ہیں خصوصاً وحشت، آرزو، ناطق کے خوشہ چین، پروفیسران اور تعلیم یافتہ حضرات اس کے ممبر ہیں۔ اس بزم کی ایک خاص کشش یہ بھی ہے کہ ہر نشست میں طعام و نوش کا خاص اہتمام ہوتا ہے

محفل میں شرکار انواع و اقسام کے کھانے مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، کباب وغیرہ سے نوازے جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مخصوص تقریب ضیافت کا دور چل رہا ہے۔

سرپرست خان بہادر رضا علی وحشت۔ صدر۔ ابو العلار حکیم ناطق لکھنوی مرحوم سکریٹری۔ پرویز شاہدی ایم اے۔ موجودہ صدر پروفیسر عبدالرحیم ایم اے (علیگ ڈھاکہ) سکریٹری امیر رضا مظہر الکاظمی ایم اے، بی ٹی۔ تقسیم بنگال کے بعد اس کی ایک شاخ ڈھاکہ میں بھی وجود میں آئی جس کے موجودہ صدر سلیم اللہ فہمی ایم اے بی سی ایس اور سکریٹری احسن احمد رشک ہیں۔

بزم جلال اور مسلم لٹریری سوسائٹی

سنہ ۱۹۴۲ء میں عالم وجود میں آئی، شاعرے، ادبی جلسے تحریری و تقریری مقابلے وغیرہ برابر ہوا کرتے ہیں اسکی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہے کہ کلکتہ اور مضافات کلکتہ کے ہر جماعت کے اہل ذوق حضرات اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے ہیں اسکے بانی اور مستقل جنرل سکریٹری ہونے کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہے۔ راقم الحروف کے پاکستان چلے آنے کے بعد محمد قاسم مہر خضر پوری کام کر رہے ہیں۔ سرپرست۔ وحشت کلکتوی و آرزو لکھنوی مرحوم۔ صدر پروفیسر عباس علیخاں بیخود ایم اے۔ نائب صدر (۱) رضا مظہری ایم اے، بی ٹی (۲) جرم محمد آبادی (۳) پروفیسر اختر حسین ایم اے (۴) ڈاکٹر عبدالغنی ۔۔۔ اراکین کمیٹی میں ابراہیم ہوش، یونس احمر ایم اے وغیرہ جیسے مشہور صحافی و فنکار قابل ذکر ہیں مسلم لٹریری سوسائٹی کلکتہ کے بانی اور سابق سکریٹری ہونے کا شرف بھی راقم الحروف کو حاصل ہے۔

اردو مجلس

سنہ ۱۹۴۰ء میں نواب دہلوی نے اسکی بنیاد رکھی۔ آجکل اس کے سکریٹری رضا مظہری ایم اے، بی، ٹی، ہیں۔

دبستان آرزو

سنہ ۱۹۴۱ء میں اس کے سنگِ بنیاد رکھنے کا سہرا آرزو لکھنوی کے تلمیذ ارشد جرم محمد آبادی کے سر ہے۔ اس کے تحت فنی معلومات تحقیق زبان و ادب اور اصلاحِ کلام کی قابل قدر و بے لوث خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔

بزم شاکری

کلکتہ کے ایک گمنام مگر ماہر فن و زبان شاعر طاہر علی شاکر کے شاگردوں کی کاوش و محنت کے سبب آج تک زندہ ہے۔ اس بزم کے تحت ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ مشاعرہ ہوا کرتا ہے اور ہر مشاعرے میں معمولی سے معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی مصرع طرح پر طبع آزمائی کرتے ہیں اس طرح ایک طرف تو ان کا شوق ادب پروان چڑھتا ہے تو دوسری طرف اردو زبان سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے وہ شخص جسکی مادری زبان بنگالی ہے اور جس کا اردو تلفظ درست نہیں آج وہ نہ صرف اردو زبان سے واقف ہے بلکہ اردو شاعری اور فن عروض پر بھی بہت حد تک حاوی نظر آتا ہے۔ اور یہ اردو کی ترقی و توسیع کے سلسلہ میں بڑی بات ہے تقسیم بنگال کے بعد اسکی ایک شاخ ڈھاکہ میں بھی قائم ہو چکی ہے۔

مندرجہ بالا انجمنوں کے علاوہ: بزم سخن (جو ۱۹۳۴ء میں علاقہ خضر پور میں قائم ہوئی اور جسکے سکرٹیری رشید الزماں خلش بی۔ اے ہیں) بزم ادب (سن قیام ۱۹۴۰ء سکرٹیری عبدالمجید ایم۔ اے ہیں) بنگال لٹریری سوسائٹی (اس کے تین شعبے انگریزی، اردو، بنگلہ ہیں۔ شعبۂ اردو کے سکرٹیری عبدالوہاب بی۔ اے اور راقم الحروف ہیں) بزم اردو (سن قیام ۱۹۴۰ء۔ صدر ابراہیم شبلی ایم۔ اے اور سکرٹیری پروفیسر طاہر رضوی ایم۔ اے) وغیرہ کی بے لوث خدمات ناقابل فراموش ہیں اس کے علاوہ مشرقی بنگال کی ادبی انجمنیں حسب ذیل ہیں۔

دائرۂ ادب ڈھاکہ چاٹگام

تقسیم ملک کے فوراً ہی بعد ۱۹۴۷ء کے آخیر میں مشرقی بنگال میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کی غرض سے عالم وجود میں آیا۔ بانیوں میں افسر ماہ پوری، عابد دانا پوری اور راقم الحروف کے نام قابل ذکر ہیں۔ خاکسار کو اس کے سابق رکن کمیٹی ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ یہ وہ واحد ادبی ادارہ ہے جہاں ۱۹۴۹ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور حضرت جگر مرادآبادی نے مشرقی پاکستان کے دورے کے سلسلہ میں ادارے کے ایک یادگار جلسہ

میں جوان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا شرکت کی اور مشرقی پاکستان کے ادبی ارتقا اور امکانات کا جائزہ لیا۔ ڈھاکہ میں انجمن ترقی اردو قائم کرنے کی کارروائیاں بھی وہیں عمل میں آئیں۔ اس ادارے کے صدر ڈاکٹر عندلیب شادانی اور سکریٹری نظیر صدیقی اور افسر ماہ پوری، عابد دانا پوری، مولانا حافظ ظہور الحق بار کی سرگرم کارکن رہ چکے ہیں۔ اس کی ایک شاخ چاٹگام میں بھی قائم ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ انجمن تحریک اردو ڈھاکہ (جس کے بانی و صدر حضرت خواجہ محمد عادل جہانگیر نگری ہیں۔

ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن ڈھاکہ، انجمن تعمیر ادب چاٹگام، بزم ادب چاٹگام قائد اعظم اردو لائبریری چاٹگام، قرآن سوسائٹی ڈھاکہ، بزم ناطق چاٹگام، ترجمان ادب، چاٹگام۔ انجمن مہاجرین چاٹگام، ریلوے انسٹی ٹیوٹ چاٹگام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فہرست بنگال میں اردو تصانیف و مطبوعات

(بعض وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو بنگال میں لکھی گئیں اور بنگال سے باہر شائع ہوئیں)

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
قصۂ مہر و ماہ	سید محمد حیدر بخش	۱۸۰۰ء	منظوم ترجمہ پند نامہ سعدی	مظہر علی ولا	۱۸۰۲ء
باغ و بہار	میر امن دہلوی	۱۸۰۱ء	ترجمہ ہفت گلشن (مصنفہ ناصر علیخاں بلگرامی)		۱۸۰۱ء
آرائش محفل یعنی قصۂ حاتم طائی	سید محمد حیدر بخش	؍؍	قصۂ مادھونل و کام کندلا	مظہر علی ولا	؍؍
گنج خوبی	میر امن دہلوی	۱۸۰۲ء	ترجمہ عہد شیر شاہ	؍؍	؍؍
نو طرز مرصع	میر عطا حسین خاں تحسین	۱۷۹۸ء	دیوان ریختہ	؍؍	؍؍
بتیال پچیسی	مظہر علی ولا	۱۸۰۲ء	اردو لغت	ڈاکٹر جان گلکرسٹ	۱۷۵۹ء یا ۱۸۴۱ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
ہندوستانی علم اللسان	ڈاکٹر جان گلکرسٹ	۱۷۵۹ء تا ۱۸۴۱ء	بارہ ماسہ دستور ہند	مرزا کاظم علی جوان	۱۸۰۴ء
صرف ونحو	″	″	خرد افروز (مجموعہ کلام میر وسودا)	″	″
ہندی کی آسان مشقیں	″	″	طوطا کہانی	سید محمد حیدر بخش	۱۸۰۲ - ۱۸۰۳
فارسی افعال کا جدید نظریہ	″	″	ترجمہ مثنوی قصہ لیلیٰ مجنوں (مصنفہ امیر خسرو)	″	″
مشرقی زباندانی	″	″	گل مغفرت	″	″
بیاض ہندی	″	″	گلزار دانش (ترجمہ بہار دانش)	″	″
اجنبیوں کے لئے رہنمائے اردو	″	″	تاریخ نادری (ترجمہ نادر نامہ مصنفہ مرزا مہدی)	″	۱۲۲۴ھ
عملی نمونے	″	″	ہفت پیکر	″	۱۸۰۵-۶ء
مکالمات ہندی وعربی	″	″	دیوان حیدر	″	″
ہندوستانی گو	″	″	آرائش محفل (ماخوذ از خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سبحان رائے)	میر شیر علی افسوس	۱۸۰۴ء
اتالیق ہندی	″	″			
مشرقی حصہ	″	″	باغ اردو (ترجمہ گلستان سعدی)	″	۱۸۰۲ء
ہندی عربی آئینہ	″	″	دیوان افسوس	″	″
انگریزی ہندوستانی لغت	الیس ڈبلیو فیلن	۱۸۵۸ء	قصہ بدر منیر و بے نظیر (ترجمہ مثنوی سحر البیان مصنفہ میر حسن دہلوی)	میر بہادر علی حسینی	۱۸۰۲-۳ء
گلدستۂ نشاط	″	۱۹۳۶-۳۷ء			
ترجمہ قرآن مجید	مولوی عبداللہ مگلی	۱۸۲۹ء	اخلاق ہندی (ترجمہ مفرح القلوب)	″	″
ترجمہ سنگھاسن بتیسی (یعنی قصہ شکنتلا مصنفہ کالیداس)	مرزا کاظم علی جوان	۱۸۰۱ء	ترجمہ تاریخ آسام (مصنفہ شہاب الدین تالش)	″	۱۸۱۶ء
			قصہ لقمان	″	″
ترجمہ قرآن مجید	″	۱۸۰۴ء	ترجمہ قرآن مجید	″	″
ترجمہ تاریخ بہمنی	″	″	ترجمہ اخوان الصفا	اکرام علی	۱۸۱۰ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت
تذکرۂ گلشن ہند (ترجمہ گلزار ابراہیم)	اکرام علی	۱۸۱۰ء
خرد افروز (ترجمہ عیار دانش مصنفہ ابوالفضل)	مولوی حفیظ الدین	۔۔
کلیاتِ میر	میر تقی میر	۔۔
صرفِ اردو (نظم)	امانت اللہ شیدا	۔۔
ہدایت الاسلام (نثر)	۔۔	۱۸۰۴ء
اخلاقِ جلالی (ترجمہ جامع الاخلاق)	۔۔	۔۔
اکبر نامہ (ترجمہ واقعات اکبر)	خلیل علیخاں اشک	۱۸۰۹ء
اردو محاورات	مرزا جان طپش	۱۸۱۱ء
کلیاتِ طپش	۔۔	۔۔
بہار عشق (ترجمہ ملادمی)	میر علی	۱۸۴۷ء
ترجمہ بائبل	سہرام پور مرکز	۱۸۰۹ء
ترجمہ عہد جدید	مرزا محمد فطرت	۱۸۰۵ء
ترجمہ عہد جدید	پادری مارٹن	۱۸۱۴ء
دیوانِ جہاں	بینی نرائن	۱۸۱۲ء
چار گلشن	۔۔	۔۔
ترجمہ تنبیہ الغافلین	۔۔	۱۸۲۹ء
ترجمہ تنبیہ الغافلین	مولوی عبداللہ	۱۸۳۰ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت
پریم ساگر	سری لال گجراتی	عہد فورٹ ولیم کالج
راج نیتی	۔۔	۔۔
لطائف ہندی	۔۔	۔۔
کشن جی	۔۔	۔۔
ہندوستانی لغت	ایس ڈبلیو فیلن	۱۸۵۸ء
گلدستۂ نشاط	۔۔	۷-۱۸۳۶ء
ترجمہ قرآن مجید	شاہ عبدالقادر	۱۲۵۲ء
بہیل یمن	نصیر الدین حیدر	۔۔
مثنوی بکاؤلی	سید ریحان الدین	۔۔
ترجمہ گل بکاؤلی (مذہب عشق)	نہال چند	۱۸۱۴ء
تاج الملوک	۔۔	۔۔
مجموعۂ قوانین	لالہ سدا سکھ لال	۱۸۳۴ء
گنگا کی لہر	۔۔	۱۸۵۴ء
گل صنوبر	ہیتم چندر	۱۸۳۷ء
اصولِ انتظام مدن	لالہ دھرم نرائن	۱۸۴۶ء
کھیت کرم	کالی رائے	۔۔
اصول علم ہیئت	پنڈت رامچندر	۱۸۴۷ء
قانون الطباع	۔۔	۔۔
جغرافیہ ہند	روپ نرائن	۔۔
مراۃ العلوم	سیتل پرشاد	۔۔

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
علم طبیعات	ہری وامن لال	۱۸۴۹ء	دیوان ضیغم	(حافظ سید اکرام احمد ضیغم)	۱۸۸۹ء
پندنامۂ کاشتکاری	پنڈت موتی لال	۱۸۵۲ء	آفتاب عالمتاب	(قاضی محمد صادق اختر)	،،
خلاصۃ النصائح	منشی بھولاناتھ	۱۸۵۴ء	عابد حیدری	،،	،،
قواعد اردو	دیوی پرشاد	،،	مطلع العلوم و مجمع الفنون	،،	،،
کلیات کرشنا	راجہ راج کرشنا بہادر	،،	گلدستۂ محبت	،،	،،
احسن المواعظ	جمنا اروپ پال کرشن کنور	،،	مثنوی سراپا سوز	،،	،،
شاہنامہ	،،	،،	صبح صادق	،،	،،
دیوان کنور	،،	،،	بہار بے خزاں	،،	،،
مجموعۂ لطائف اردو	،،	،،	بہار اقبال	،،	،،
نسخۂ دلکشا	راجہ جگجوتی ستارام	۱۸۷۰ء	گنج نیرنگ	،،	،،
لغت سنسکرت اور ہندوستانی	راؤ کانت	،،	ہفت اختر	،،	،،
متھرالامرا (فارسی)	متھراداس		دیوان ریختہ	،،	،،
مثنوی شرف	شرف النساء	۱۸۳۸ء	دفتر بے مثال	عبدالغفور نساخ	،،
دیوان اوحد	عبدالودود اوحد	،،	تذکرۂ سخن شعراء	،،	۱۸۷۵ء
نوید برہان	آغا احمد علی	۱۸۶۵ء	تذکرہ المعاصرین	،،	؟
شمشیر تیز تر (فارسی)	،،	۱۸۶۸ء	قند پارسی (فارسی)	،،	،،
ترانہ (فارسی)	،،	۱۸۶۷ء	گنج تواریخ	،،	،،
اشتقاق	،،	،،	ارمغانی (دیوان چہارم)	،،	؟
ہفت آسمان	،،	۱۸۷۲ء	زبان ریختہ	،،	؟
دیوان آزاد	نواب سید محمد آزاد	۱۸۸۹ء	قطعۂ منتخب	،،	؟

اختر کی تاریخ وفات ۱۸۵۸ء ہے انکی زندگی میں یہ کتابیں طبع ہو چکی تھیں۔

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	اشاعت
انتخاب نقص	عبدالغفور نساخ	۱۸۷۵ء	رباعیات شہباز	پروفیسر عبدالغفور شہباز	۱۹۴۲ء
مظہر معمار	"	"	عبرت (ناول)	خواجہ عتیق اللہ	"
چشمۂ فیض	"	"	دیوی چودھرائن (ناول)	"	"
شاہد عشرت	"	"	خدا کی شان (ناول)	"	"
مرغوب دل	"	"	خوبیٔ قسمت (ناول)	خواجہ محمد اشرف	"
اشعار نساخ	"	"	مجموعۂ تواریخ (تین جلد قطعات تاریخ)	خواجہ محمد افضل	"
ارمغاں	"	"	غم ماہ پیکر (قطعات تاریخ)	"	"
ترانۂ خامہ	"	"	دیوان شمس (ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس)		"
باغ فکر معروف بہ قطعات نساخ	"	"	نالۂ عصیم	عبدالحلیم عصیم	"
سوانح عمری نساخ	"	"	دیوان عزیز (عبدالعزیز تلمیذ نساخ)		"
طومار اغلاط	"	"	بڑی بہو (ناول)	خواجہ محمد اعظم	"
ترجمہ پند نامہ (مصنفہ فرید الدین عطار)	"	"	ثلاثۂ غسالہ	حکیم حبیب الرحمن -	۱۸۸۱ء تا ۱۹۴۴ء
			آسودگان ڈھاکہ	"	"
خیالات آزاد	نواب سید محمد آزاد	۱۸۸۹ء	مساجد ڈھاکہ	"	"
سوانح عمری آزاد	"	۱۹۰۸ء	ڈھاکہ پچاس برس پہلے	"	"
نوابی دربار	"	"	کچھ اپنی باتیں	"	"
دیوان شائق	(خواجہ فیض الدین شائق)	"	ڈھاکہ کی تاریخی عمارتیں	"	"
تفریح القلوب	پروفیسر عبدالغفور شہباز	۱۹۴۲ء	رقعات پدر و پسر	محمود و محب الرحمن خاں بنگالی	؟
خیالات شہباز	"	"	تاریخ ہند (سات بار چھپی)	عبدالکریم سلہٹی	۱۸۵۶ء تا ۱۹۳۶ء
زندگانی بے نظیر	"	"	اسلام اور عروج سائنس و تمدن	"	"

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
ترجمان القرآن	ابوالکلام آزاد	؟	جامع القواعد	مولانا حافظ محمود	۱۹۲۷ء
دیوان وحشت	رضا علی وحشت	۱۹۱۰ء	انتخاب	"	"
ترانۂ وحشت	"	۱۹۵۳ء	دیوان اکمل	اکمل علی اکمل	۱۹۴۴ء
مقالاتِ وحشت	"	غیر مطبوعہ	دیوان سرور	بشیر خاں سرور	؟
مسئلۂ قربانی	(مولانا عبدالرؤف داناپوری)	۱۹۱۰ء	دیوان نشتر	عبدالکریم	؟
یادگار	"	۱۹۱۲ء	احسن (ناول)	بدرالزماں بدر	؟
اصح السیر (سیرت)	"	۱۹۳۴ء	شکست و فتح	جمیل مظہری	۱۹۵۰ء
البرہان	"	؟	نقشِ جمیل	"	۱۹۵۳ء
تریاق	"	؟	زنجیر محبت (ناول)	محمد سلیمان دا صفت	۱۹۰۴ء تا ۱۹۵۳ء
اسلام اور مذہبی مسائل	"	؟	پرتھوی راج	"	"
خطبات	"	؟	پاکستان	"	"
نظم اردو	(حکیم ابوالعلا ناطق لکھنوی)	؟	اردو بنگلہ سیکھے پڑھو (کتابچہ)	فطرت واسطی	؟
بچوں کی کہانیاں (پریم بجاری)	ڈاکٹر عندلیب شادانی		جولیس سیزر (ڈرامہ)	محمد سلیمان صفت	"
نوش و نیش (افسانے)	"		جگے دس وتا تار	"	"
چھوٹا خدا (")	"		شاستا	"	"
تحقیقات (تنقید)	"		عورت کا انتقام (فلمی کہانی)	"	"
دورِ حاضرہ اور غزل گوئی (تنقید)	"		نادر شاہ (ڈرامہ)	"	"
نشاطِ رفتہ (مجموعہ کلام)	"		نظام حکومت	(رضا مظہری الکاظمی)	۱۹۳۹ء
گلستانِ شرف	شرف الدین شرف	۱۹۳۷ء	گلشن اردو	(پروفیسر طاہر رضوی)	۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۴ء
شیخ نبی کے پروانے	مولانا حافظ محمود	؟	خیابانِ ادب	"	"

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
دبستان رضویہ	(پروفیسر طاہر رضوی)	۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۴ء	یادگار صحیفہ	صحیفہ بانو	۱۳۳۲ھ
انتخاب سبزواریہ	"	"	قید فرنگ (مضامین)	سیدہ اختر	"
چمنستان ادب	"	"	پریمی (ناول)	راحت آرا بیگم	؟
اردو کمپوزیشن	وحید النبی وحید	"	فیروزہ "	جمیلہ بیگم	؟
خیر و شر (ڈرامہ)	وحید النبی وحید	؟	روشنک بیگم "	محمودہ بیگم	؟
ترجمۂ دیوان کامران	پروفیسر محفوظ الحق	؟	ضبط تولید (ترجمہ)	پروفیسر شمس شیدائی	
ترجمۂ رباعیات عمر خیام	"	؟	جام بیخودی (پروفیسر	عباس علیخاں بیخود)	۱۹۴۶ء
کوکب دری	خجستہ اختر سہروردی	؟	سنگریزے (افسانے)	محمد یونس احمر وغیرہ	۱۹۴۴ء
آئینۂ عبرت	"	؟	ترجمۂ ہریلی بانسری مصنفہ قاضی نذر الاسلام	"	؟
دیوان خمار	رہ جبین خمار	؟	گلابی نادے	ساجن پردیسی	۱۹۴۵ء
صحیفۂ فطرت (مضامین)	"	؟	جام نو (حالات و کلام شعراء)	تابان القادری	۱۹۴۶ء
بانسری کی آواز (افسانے)	راحت آرا بیگم	۱۹۱۰ء تا ۱۹۴۹ء	شام روح	"	۱۹۵۱ء
شب کی پکار "	"	"	برق و باراں (پروفیسر	احسن احمد اشک)	
بدر کی بیٹی "	"	"	مشرق (ریڈیائی تقاریر)	ابوالمکارم سلیم احمد فضلی	۱۹۵۳ء
دلنواز "	"	"	خون جگر ہونے تک (ناول)	فضل احمد کریم فضلی	"
انقلاب "	"	"	چشم غزال (مجموعۂ کلام)	"	"
غنچۂ افسانہ "	"	"	جمع القرآن (مولانا تمنا	عمادی، پھلواروی	"
دیوان راحت (مجموعۂ کلام)	"	"	انتخاب کلام مسلم شعرائے بنگال (ترجمہ)	احسن احمد اشک اور یونس احمر	۱۹۵۴ء
رادھا (ناٹک)	"	۱۸۳۸ء تا ۱۸۸۰ء غیر مطبوعہ	پیام نو	وفا راشدی	۱۹۴۹ء
مثنوی شرف النساء	شرف النساء شرف مرشد آبادی		بنگال میں اردو	"	۱۹۵۵ء جنوری
			حیات وحشت	"	زیر طبع

ماخذ

کتابیں	نام مصنف	رسائل
خطبات گارسن دی تاسی	گارسان دی تاسی	نگار اردو شاعری نمبر ۳۵ء ۱۹
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	ماہنامہ ادبی دنیا لاہور
آب حیات	محمد حسین آزاد	سہ ماہی اردو دکن
تاریخ نظم و نثر اردو	آغا محمد باقر	ماہنامہ جدید اردو کلکتہ
گلِ رعنا	عبدالحیٔ	ماہنامہ اختر بولائی ہیمن سنگھ
نظم اردو	ناطق لکھنوی	اودھ پنچ لکھنؤ
تذکرۂ سخن شعراء	عبدالغفور نساخ	ماہنامہ مسلم ریڈیو، کلکتہ
مقالات وحشت	رضا علی وحشت	سلیکشن فروم دی ریکارڈس آف بنگال گورنمنٹ
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	اخبار انڈین میل ۱۴ مارچ ۱۸۶۴ء
مدراس میں اردو	"	
مشرقی پاکستان کے اردو ادیب	عندلیب شادانی اور دیگر	

وفا راشدی

۱۲ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء

۱۷ جمادی الاوّل سنہ ۱۳۷۴ھ

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۲	جاچکی	چھاچکی	۶۰	۱۹	رکھتی ہیں	رکھتے ہیں
۶	۱۶/۲۰	میں وفات	سن وفات	۶۰	۲۰	حالات وعزم	حالات وکلام
۱۱	۲۱	عہد برطانیہ عیسائی	عہد برطانیہ میں عیسائی	۶۱	۵	مقصد	معیار
۱۲	۱۱	یعنی فنکاروں	ایسے فنکاروں	۷۵	۱۰	شمس کے	شمس سے
۱۳	۱۷	پوتی	پوتھی	۸۶	۶	جریدار دو	جدید اردو
۱۸	۲	بامحاورہ زبان	بامحاورہ وآسان زبان	۸۸	۷	نے توسط	کے توسط
۱۸	۴	ڈاکٹر گلکرسٹے	ڈاکٹر گلکرسٹ	۸۸	۱۲	معقول	مقبول
۲۴	۲	فرحم علی	فرجم علی	۹۰	۱۲	اخضر	احمد
۳۰	۱۰	جبس عنایت	حسن عنایت	۹۰	۱۸	سوا کچھ	سوا بہت کچھ
۳۱	۳	قدوت	قدرت	۹۰	۲۰	مشہور قاضی	مشہور صحافی
۳۶	۱۰	اکابرین مخفی	اکابرِ سخن	۹۵	۹	صرف اساتزہ	صفِ اساتذہ
۴۰	۵	ضیغم مناظر	ضیغم سانظر	۹۷	۱	دلیش	ریش
۴۰	۱۲	باعث نفوس	باہمت نفوس	۹۸	۲۰	قرآنِ مجید موجود	قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر موجود
۴۲	۱	نساخ کے یادگار	نساخ کی یادگار	۱۰۱	۴	کازنانہ	کارنامہ
۴۶	۸	ھام وفاضل	عالم وفاضل	۱۰۱	۹	کاکام	کانام
۵۲	۳	زار	زور	۱۰۱	۱۶	کلام من	کلام میں
۵۶	۱۸	وبال	دال	۱۰۲	۱	۱۹۱۰ء	۱۹۱۰ء میں
۵۹	۱۵	شامل کیا	شامل کیے	۱۰۲	۱۳	غالب ونیر	غالب وتمیر
۵۹	۱۸	شانِ شاعر	شانِ شاعری	۱۰۳	۱۳	طبع آزمائی کی	طبع آزمائی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۴	۴	بایں عہد	بایں ہمہ
۱۰۴	۱۶	اچھوت خیالات	اچھوتے خیالات
۱۰۶	۱۲	بیگانۂ خوبی	بیگانۂ خوئی
		سلیس پیرایہ	لطیف پیرایہ
۱۰۸	۳	حسن کو	جس کو
۱۰۹	۱۵	فلم میں	نظم میں
۱۱۰	۲	اُنگ	ڈھنگ
۱۱۱	۱۷	کیپٹن صدیقی	کیپٹن قمر صدیقی
۱۱۱	۱۸	امیران سلام	امیرالاسلام
۱۱۱	۱۹	قربان علی بصری	قربان علی عصری
۱۱۲	۸	نمو مولانا	نحو مولانا
۱۱۲	۱۸/۱۹	ہے	سے
۱۱۳	۱۶	۱۹۵۱ء	۱۹۵۰ء
۱۱۶	۵	تھے بہارے بزم دل	تھے بہاری بزم دل
۱۱۷	۱۸	اسٹیج بحیثیت ڈراما نویس اور ہدایت کار۔	
۱۱۸	۱	ان کے صنعتی	ان کے منشی
۱۱۸	۲۰	شعر گرم مناہو	شعر گرم بنتا ہو
۱۲۶	۶	منفحات	مغتنمات
۱۲۶	۱۰	انہوں	انہوں نے
۱۲۹	۱۴	شیرۂ آفاق	شہرۂ آفاق
۱۳۲	۸	رے کریم	اے کریم
۱۳۳	۱۵	کہ فاضل	کے فاضل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۳	۱۸	شمس کے	شمس سے
۱۳۴	۱۱	انہیں کے	اولین
۱۳۶	۱۹	زنگ خط	ایک خط
۱۳۶	۲۱	بنگلہ۔ برصغیر کو	——
۱۴۱	۷	نکاہید	نکاہیہ
۱۴۲	۱۱	خدمت پیش	خدمت میں پیش
۱۴۳	۲۱	ان کا نثر و نظم	انکا ز نثر و نظم
۱۴۵	۱۳	ماہنامہ قدیم	ماہنامہ ندیم
۱۴۶	۱۳	شاگردوں ہندو	شاگردوں میں ہندو
۱۵۱	۴	قمر و مباہات	فخر و مباہات
۱۵۳	۳	رود کلامی	زود کلامی
۱۶۴	۲	امن ہیں	ان ہیں
۱۶۵	۸	ماعدے	مساعدت
۱۶۵	۱۲	بمطرح کلام شاہد	بمطرحی کلام شائع
۱۶۴	۷	کا میں	کالبد میں
۱۶۸	۱۰	فن پر	فنِ موسیقی پر
۱۸۱	۱	ممتاز الشعراء	ممتاز شعراء
۱۸۲	۸	علامہ	علاقہ
۱۸۹	۸	کلکٹر بھکنا	کلکٹر کھلنا
۱۹۱	۱۰	قواعد	حضرات
۱۹۲	۳	غیر معمولی سی خدمت	غیر معمولی خدمت
۱۹۲	۴	وجد آفرینی	وجد آفریں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۶	۹	بنارس	فارسی
۲۰۲	۱۹	آزاد مرحوم	آرزو مرحوم
۲۰۸	۱۲	ہے	ہیں
۲۰۹	۶	تلمیذ	—
۲۱۱	۴	اچھوتخیالات	اچھوتے خیالات
۲۱۸	۱	عشر انصاری	عشرت انصاری
۲۲۵	۲	اکابرین سخن	اکابر سخن
۲۲۷	۲۱	عبث	بحث
۲۲۸	۷	حاصل کریں	حاصل کیں
۲۲۹	۱۴	آتے پاتے	آنے پاتے
۲۴۵	۱۹	کر رہا ہے	کرایا ہے
۲۴۶	۷	فاضل درسی	فاضل کی درسی
۲۵۲	۱۳	تعریف بھی	تعریف میں
۲۵۲	۱۴	انہیں دوستوں	انہیں دوستوں
۲۷۲	۱۰	ٹھوس محبت	ٹھوس بحث

حیاتِ وحشت

مصنف وفا راشدی

علامہ رضا علی وحشت دنیائے شعروادب میں جس ممتاز و ممیز مرتبہ کے حامل ہیں اُس کی وضاحت تحصیلِ حاصل ہے۔

حیاتِ وحشت میں وفا راشدی نے علامہ وحشت کی زندگی، شخصیت و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وحشت کے انگریزی اور اردو مقالات، خطوط اور تقاریر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہند و پاک کے مشہور و ممتاز شعرائے کے کلام پر وحشت کی اصلاحوں کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

چونکہ وفا راشدی علامہ موصوف سے ہمیشہ بہت قریب رہے اور ان کی صحبتوں سے برابر مستفید ہوتے رہے۔ لہٰذا یہ تصنیف اپنی جامعیت و افادیت میں بے مثال ہے۔ وفا راشدی کے خاص اسلوب بیان نے حیاتِ وحشت کو اور بھی دلچسپ و دلآویز بنا دیا ہے۔

(زیر طبع)

ناشر

مکتبہ اشاعت اُردو۔ ۲۴۴۳

جیل روڈ۔ حیدر آباد سندھ (پاکستان)

پیامِ نو

مؤلف وفا راشدی

- ملک کے مشاہیر کی بلند پایہ نظمیں اس میں شامل ہیں۔ وفا صاحب نے ان نظموں کو یکجا جمع کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے (علامہ رضا علی وحشت)
- پیام نو کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ اس میں پنجاب سے لیکر بنگال تک اور یوپی سے لے کر دکن تک اردو کے ہر مرکز کا نمائندہ موجود ہے۔ یہ جامعیت معاصرانہ نظم کے مجموعہ میں شاذونادر ہی نظر آتی ہے (ڈاکٹر عندلیب شادانی)
- یہ مجموعہ اردو ادب کے شائقین کے لئے بہت بیش قیمت ہے۔ اس کے لے انھیں وفا راشدی کے صحیح ذوق اور کاوشِ محنت کا ممنون ہونا چاہیئے۔ (مخزن لاہور)
- "پیام نو" راشدی کی ایک جدت ہے۔ یہ نہ صرف محفوظ رکھنے کی چیز بنگئی ہے بلکہ ادب کی تاریخ مرتب کرنے والوں کو بھی اسکی جستجو رہا کرے گی۔ (ہمایوں۔ لاہور)
- اس کتاب نے ایک تذکرے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ (نگار۔ لکھنؤ)
- یہ مجموعہ اردو میں ایک نئی طرز کا تذکرہ بھی ہے اور جدید شاعری کے عمدہ انتخابات کا گلدستہ بھی۔ (سب رس حیدر آباد دکن)
- مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب جدید رجحاناتِ شاعری کے نمونوں کا اچھا مجموعہ ہے۔ (معارف اعظم گڑھ)
- جس مقصد کے پیش نظر وفا راشدی نے خالص قومی و انقلابی نظموں کا یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے وہ اپنی خاص افادیت رکھتا ہے۔ اردو ادب کی جدید تاریخوں میں ایسے مجموعہ کو کافی اہمیت حاصل ہوگی۔ (ایشیا بمبئی)

گرد پوش جاذبِ نظر ——— قیمت مجلد ۲/۸

ناشر

مکتبۂ اشاعتِ اردو

۲۴۴ جیل روڈ۔ حیدر آباد (پاکستان)
(سندھ)